البیرونی

اور جغرافیۂ عالم

مولانا ابوالکلام آزاد

Marfat.com

البیرونی اور جغرافیۂ عالم

از

ابوالکلام آزاد

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان
۱۸۰۸۶ — الحیدری، کراچی ۳۳

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

136086

تصنیف	البیرونی اور جغرافیہ عالم
مصنف	مولانا ابوالکلام آزاد
اشاعت اوّل	جولائی سنہ ۱۹۸۰ء
ناشر	ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی
اشاعت ثانی	۲۲ فروری سنہ ۱۹۸۲ء
ناشر	ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۰۸۶۔ الحیدری، کراچی ۳۳
تعداد	ایک ہزار
قیمت	۱۸ روپے
طابع	المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ) پاک چوک، کراچی

ملنے کے پتے

عصری مطبوعات

اے/۳۲۲۔ بلاک ڈی۔ ناظم آباد۔ کراچی ۳۳

مکتبہ شاہد

علی گڑھ کالونی کراچی ۴۱

Marfat.com

فہرست

البوریحان اور ابوالکلام		۵
پیش لفظ		۶
ابوالکلام آزاد	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	۹
البوریحان البیرونی	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۲۵
کچھ مخطوطے کے بارے میں	جناب مسیح الدین	۴۹
البیرونی اور جغرافیہ عالم	مولانا ابوالکلام آزادؒ	۵۵
القانون المسعودی		۷۱
پروفیسر توگان کی کامیابی		
عربی میں ہیئت کی پہلی کتاب		
الہیئۃ الکرومی اور الہیئۃ التجربی		
ہندی حساب کی بنیادی غلطیاں		
البیرونی کا عہد اور عربی فن جغرافیہ و تخطیط		۷۶
البیرونی کا علمی کارنامہ		
ہفت اقلیم		۸۶
اقلیموں کی مساحت اور کرہ کی مجموعی مساحت		۸۸
قبۃ الارض اور بعض قدیم مقامات		
قبۃ الارض		
بعض قدیم مقامات		
البیرونی کے اطوال اور موجودہ اطوال کا فرق		

اُس عہد کی جغرافیائی تحقیقات کی بعض خصوصیتیں ۹۷

محمود غزنوی اور البیرونی ۱۰۲

ہندوستان میں البیرونی کی حدود سیاحت ۱۱۲

البیرونی کی دماغی سیرت ۱۱۴

الصیدنہ اور الجماہر ۱۱۹

ہندوستان اور حکیم ابوریحان بیرونی ۱۲۰

کتاب الہند

ہندوستان کے سمجھنے میں دشواریاں

۱۔ زبان

۲۔ دینی اختلاف

۳۔ رسوم و عادات

۴۔ مسلمانوں کا حملہ

۵۔ تنگ نظری

کتاب الہند: ۱۲۴

ہندوستان کے فنون لطیفہ اور عرب

راگ کے ذریعے شکار کا طریقہ

اصطلاحات ۱۲۶

البیرونی کا پورا نام برہان الحق ابو ریحان محمد بن احمد تھا۔ البیرونی کے عرف سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ مطابق ۴ ستمبر ۹۷۳ء کو خوارزم کے پایۂ تخت کاث میں پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت کے مراحل خوارزم میں طے ہوئے۔ ۲۰ برس کی عمر میں وطن سے نکلے کچھ عرصہ بخارا میں رہے پھر جرجان اور طبرستان کے حاکم شمس المعالی قابوس کی ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد مختلف مدتوں تک خوارزم کے حاکم علی بن مامون، ابو العباس مامون اور غزنوی سلاطین میں محمود، مسعود اور مودود کے درباروں سے وابستہ رہے۔ تقریباً ۴۱۰ھ میں وہ محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے اور ۴۲۲ھ تک وہ پنجاب، کشمیر اور سندھ کے مختلف مقامات پر رصد، مشاہدہ، سنسکرت زبان کی تحصیل اور ہندوستانی علوم و فنون کے مطالعے میں مصروف رہے۔

البیرونی فارسی، عربی، شامی، ترکی، خوارزمی، جرجانی، عبرانی، یونانی زبانیں اور سنسکرت سے واقف اور مذہب، فلسفہ، طب، تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، نجوم، ریاضی اور ان علوم کی مختلف شاخوں میں نظر و عبور رکھتے تھے۔

البیرونی نے اپنے پیچھے مختلف علوم و فنون میں تقریباً ۱۸۰ کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے کتاب الہند، الآثار الباقیہ، قانون المسعودی، تحدید نہایات الاماکن، الجماہر فی معرفۃ الجواہر، الصیدنہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

البیرونی نے ۷۵ برس کی عمر میں ۲ رجب ۴۴۰ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۰۴۸ء کو غزنی میں انتقال کیا۔

محی الدین احمد نام، ابو الکلام کنیت اور آزاد تخلص تھا۔ والد کا نام خیر الدین ابن محمد ہادی اور وطن آبائی دہلی تھا۔ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق اگست ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم کا آغاز مکہ معظمہ میں ہو گیا تھا کہ والد عازم ہندوستان ہوئے۔ تعلیم کے بقیہ مراحل کلکتہ میں طے ہوئے۔ ۱۶ برس کی عمر میں وہ درس نظامی کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے۔

۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۰ء تک نیرنگ عالم، المصباح، احسن الاخبار، خدنگ نظر، لسان الصدق، الندوہ، وکیل، دار السلطنت وغیرہ اداروں میں معاون، نائب یا مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے الہلال کلکتہ سے جاری کیا جو صحافت، ادب، مذہب اور سیاست کا ایک بے مثال صحیفہ تھا۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۵ء تک چھ بار آزادی وطن کی خاطر قید و بند کی منزل سے گزرنا پڑا۔ قید کی مجموعی مدت ساڑھے دس برس بنتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مقرر ہوئے اور اپنی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔

عربی مولانا کی مادری زبان تھی، فارسی کے امام، اردو کے مصنف اور انگریزی سے واقف تھے۔ وہ مذہب، سیاست، فلسفہ، ادب، شاعری، تاریخ، جغرافیہ، ہیئت وغیرہ علوم میں گہری نظر رکھتے تھے۔ تذکرہ، ترجمان القرآن، غبار خاطر، انڈیا ونس فریڈم، البیرونی اور جغرافیہ عالم ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولانا نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں انتقال فرمایا۔ جامع مسجد کے سامنے ان کا مزار ہے۔

Marfat.com

پیش لفظ

اردو زبان اور اس کی ترقی و اصلاح مولانا ابوالکلام آزاد کا زندگی بھر موضوع رہا۔ انکی علمی زندگی کا باقاعدہ آغاز "لسان الصدق" سے ہوتا ہے جو انجمن ترقی اردو کا پہلا باقاعدہ ترجمان تھا اور جس کے اجرا کے چار مقصد میں سے تین اردو زبان کی ترقی، علمی مذاق کی اشاعت اور اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو تھے۔ یہ واقعہ نومبر ۱۹۰۲ء کا ہے لیکن اگر مولانا کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش ہو تو "لسان الصدق" کے اجرا کے واقعے سے کم از کم ایک سال پیچھے لوٹنا پڑے گا۔ اس وقت مولانا ہمیں ایک تذکرۃ الشعرا کی تالیف میں مصروف نظر آتے ہیں جس کا ابتدائی حصہ انہوں نے مکمل بھی کر لیا تھا۔ اس وقت وہ ہمیں فارسی لغت کی تحقیق اور ایک فرہنگ جدید کی تدوین میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اگرچہ آج دنیا کے علم میں تذکرۃ الشعرا کے ایک مضمون حکیم خاقانی شروانی (مخزن لاہور اگست ۱۹۰۲ء) کے سوا ان دونوں چیزوں کا کوئی وجود نہیں لیکن خدمتِ زبان کے باب میں ہم ان کے ذوق اشتغال سے بے خبر نہیں ہیں۔ پنکچویشن کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون اردو کے رموز اوقاف اور علامات قرأت و تحریر پر خدنگ نظر لکھنؤ (اکتوبر و نومبر ۱۹۰۳ء) کی دو اشاعتوں میں چھپا تھا اس لیے اگر پس منظر کو چھوڑ کر بھی تاریخ کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا جائے تو مولانا کے ذوق و خدمتِ ادب و لسانیات کی تاریخ کا آغاز ۱۹۰۲ء کے وسط سے جب کہ ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی ثابت ہو جاتا ہے۔ پھر مولانا کا یہ ذوق و اشتغال زندگی بھر رہا۔

۱۹۱۲ء میں "الہلال" کا اجرا محض تاریخ صحافت کا ایک یادگار واقعہ نہ تھا اس سے ادب و لسانیات کی تحریک کے فروغ و قبولِ عام کا ایک دور بھی شروع ہوتا ہے۔ مولانا نے "الہلال" جن مقاصد اور جن افکار و تعلیمات کی اشاعت کے لیے نکالا تھا تو صرف ان کا میڈیم اور ذریعہ ابلاغ ہی اردو زبان نہ تھی بلکہ وہ علمی اکتشافات و تحقیقات اور تراجم و اصطلاحات کی ایک دعوتِ عام اور لسانیات کے موضوعات اور طباعت کے مسائل پر افکار و معلومات کی اشاعت، تبادل خیالات کا بہت بڑا ذریعہ بھی تھا۔ ان موضوعات پر "الہلال" کے صفحات میں نہایت بیش قیمت مقالات و معلومات موجود ہیں۔

۱۹۲۷ء میں جب "الہلال" دوبارہ جاری ہوا تب بھی اس کے مقاصد کا دایرہ اتنا ہی وسیع تھا جتنا کہ دور اول میں تھا اور اس کے صفحات میں اردو زبان کی ترقی اور طباعت کے مسایل پر افکار و معلومات کا اتنا ہی قابلِ قدر ذخیرہ بھی موجود ہے۔ اس کے بعد بھی اردو ٹائپ، ٹائپ رائٹر کے مسایل سے وہ ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے اور ان کے اختیار و رواج کو وہ اردو زبان کی ترقی کے لیے بنیادی اور سب سے

اہم ضرورت سمجھتے تھے۔

زندگی کے آخر دور میں وہ "تذکرہ" میں طرز کتاب اور املا کی اصلاح میں مصروف نظر آتے ہیں ان کے ان اشغال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے پچپن سال سے زیادہ گیسوئے اردو کو سنوارنے میں صرف کیے تھے۔

اردو املا کے بارے میں مولانا کے بعض خاص اختیارات تھے۔ "الہلال" میں انہوں نے ان کا اہتمام کیا تھا لیکن قومی زندگی کے روزمرہ مشاغل اور وقت کے تقاضوں نے انہیں ان کے ترک پر آمادہ کر دیا تھا اور دورِ آخر میں وہ سہل نگاری کی طرف مایل ہو گئے تھے اور بہت آسان زبان استعمال کرنے لگے "الہلال" اور دورِ خلافت کے برعکس ان کی تقاریر کی زبان بھی بہت سادہ اور عام فہم ہو گئی تھی۔ تحریر کو سادہ اور عام فہم بنانے کے لیے انہوں نے املا میں بعض اصلاحات اختیار کر لی تھیں۔ مالک رام کی نظر سے "تذکرہ" کا وہ نسخہ گزرا ہے جو دورِ آخر میں مولانا کے زیر نظر تھا۔ اس میں مولانا نے طرزِ کتابت اور املا میں اصلاحات فرمائی ہیں۔ تذکرہ اور غبارِ خاطر کے آخری ایڈیشن ان اصلاحات کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے سابقہ طرزِ کتابت کے برعکس امتہ، سنۃ وغیرہ الفاظ کو امت، سنت بنا دیا گیا ہے۔ ترکیب اضافی و توصیفی میں ہمزہ کی جگہ "ے" بنا کر علمائے کرام، صلائے عام وغیرہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح آزمایش وغیرہ الفاظ میں ہمزہ کو "ی" سے بدل دیا گیا ہے۔ مولانا "تیار" لکھنے کے عادی تھے۔ لیکن اب مولانا کی اصلاحات کے مطابق اسے بھی "تیار" کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ الفاظ جن کے آخر میں "ے" آتی ہے۔ ان پر ہمزہ کے استعمال کا مسئلہ تھا۔ اب یہ قاعدہ بن گیا ہے۔ کہ "ے" سے پہلے حرف مکسور ہو تو ہمزہ نہیں لکھا جاتا مثلاً "لیے"، "دیے"، "کیے" وغیرہ۔ اس کے سوا دوسرے لفظوں میں ہمزہ استعمال کریں گے مثلاً "گئے"، "پئے"، "ہوئے" وغیرہ۔ پہلی قسم میں ہمزہ کا استعمال اور دوسری قسم میں نقطوں کا استعمال درست نہیں سمجھا جاتا۔ ہائے مخلوط کے استعمال میں احتیاط اور ہر مستقل لفظ کو الگ لکھنے کا اہتمام مولانا کو شروع سے تھا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں "الہلال" دوبارہ جاری کیا تو اس کا انتظام مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سپرد تھا۔ ان کی نظر مولانا کے املا اور رسم الخط کے خصائص پر نہ تھی۔ مولانا نے انہیں جن امور کی طرف توجہ دلائی ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بلا ضرورت انگریزی اسماء و مصطلحات استعمال نہ کی جائیں۔ مثلاً رپورٹ، اسٹیٹ منٹ، کانفرنس، پارلیمنٹ، ایڈیٹر۔ ان کے لیے روداد، بیان، موتمر، مجلس یا مجلس حکومت، مدیر وغیرہ الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ حتی الامکان ہر لفظ کو الگ اور مستقلاً لکھنا چاہیے۔ مثلاً سمجھ کر، پہنچ کر، اس کو۔

۳۔ ہائے مخلوط اور غیر مخلوط کا فرق ملحوظ رکھا جائے۔ مثلاً گھانا، انھیں وغیرہ میں ہائے مخلوط ہے مگر کہیں، نہیں

Marfat.com

وغیرہ میں غیر مخلوط ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے طرز کتابت میں ایک تبدیلی یہ آگئی تھی کہ وہ آخر حرف ہا، اور الف کو محل استعمال کے مطابق "یا" سے بدل دیتے تھے مثلاً فلسفہ کی کتاب، تجربہ کی بات، مشاہدہ کی ضرورت، مطالعہ کا شوق وغیرہ جملوں میں وہ فلسفے، تجربے، مشاہدے اور مطالعے کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اگرچہ اس کا پورا اہتمام تذکرہ اور غبار خاطر کی آخری اشاعتوں میں بھی نظر نہیں آتا۔

مولانا آزاد کے ان اختیارات و اصلاحات کی موجودگی میں یہ توقع بے جا نہیں ہو سکتی کہ اب مولانا کی جو کتاب بھی مرتب کی جائے گی اس میں ان امور کا خیال رکھا جائے گا۔ لیکن جب ہم البیرونی اور جغرافیہ عالم کے منظر پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ اس میں ان امور کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا اس میں طرز کتابت کی یکسانیت بک قلم مفقود ہے۔ چنانچہ اس میں تیار، پرانا، گاؤں، نویں وغیرہ کا املا ان شکلوں کے علاوہ طیار، پورانا، گانوں، نوے اور نوویں بھی ملتا ہے۔ ہائے مخلوط و غیر مخلوط کے فرق، اضافت میں ہمزہ کے بجائے "ے" اور لفظوں میں ہمزہ یا "ے" کے استعمال میں کوئی احتیاط نہیں برتی گئی۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ مولانا کی اصلاحات کے مطابق اس مقالے کو تیار کر دیا جاتا تاکہ پوری کتاب املا اور طرز کتابت کے ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی۔ اسی طرح انگریزی الفاظ و اسماء میں اگر کوئی غلطی مولانا کے سہو قلم سے یا نقل نویس کی عدم توجہ سے مسودے میں راہ پا گئی تھی تو اسے متن ہی میں درست کر دیا جاتا۔

ہم اس اعتراف کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کتاب کی اشاعت جامعہ ملیہ کی بہت بڑی خدمت ہے لیکن اس میں اصلاح کے عمل سے مایوسی ہوتی ہے۔ زیر نظر اشاعت میں ان نقائص کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اشاعت کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس میں ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کے قلم سے مولانا آزاد پر ایک ایسا مقالہ شامل ہے جس میں البیرونی کے مطالعے سے مولانا آزاد کے ذوق کی نصف صدی سے زیادہ طویل تاریخ مرتب ہو گئی ہے اس مقالے میں مولانا نے مختلف علوم و فنون کی جو اردو یا انگریزی مصطلحات استعمال کی ہیں، ان کی فہرستیں مرتب کر دی ہیں۔ "ہندوستان اور حکیم البوریحان بیرونی" کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون "الہلال" کے صفحات سے لے کر اور کتاب الہند کے بارے میں ایک طویل اقتباس "غبار خاطر" سے اخذ کر کے بھی اس کتاب کی زینت بنا دیا گیا ہے۔ ان اصلاحوں اور اضافوں سے "البیرونی اور جغرافیہ عالم" کی اس اشاعت کی اہمیت یقیناً بہت بڑھ گئی ہے۔

Marfat.com

ابوالکلام آزادؒ

مولانا کے سوانح علمی کا ایک ورق اپنی وفات سے پانچ برس پہلے یکم فروری ۱۹۵۳ء کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے نیشنل لائبریری کلکتہ کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی تھی وہ محض رسمی افتتاحی تقریر ہی نہ تھی بلکہ اس میں مولانا نے اپنے علمی سوانح کا ایک ورق بھی اہل علم کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ مولانا نے فرمایا تھا:

"جب نیشنل لائبریری کی کونسل نے مجھے دعوت دی کہ میں لائبریری کی نئی عمارت میں اس کا افتتاح کر دوں تو میرے حافظہ میں قدرتی طور پر اب سے ۴۸ سال پہلے کے ایک واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی جب میں پہلی بار اس لائبریری میں داخل ہوا تھا۔ یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے، اس وقت میں صرف ۱۶ سال کا ایک لڑکا تھا۔ میری تعلیم ختم ہو چکی تھی اور قدیم تعلیمی نظام کی روایت کے مطابق مشق اور استعداد بہم پہنچانے کے لیے مختلف مضمونوں کے طلبہ کی ایک جماعت کو میں نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ لائبریری کے بہار کلیکشن میں البیرونی کی مشہور تصنیف "القانون" کا ایک نادر مخطوطہ ہے۔ یہ سن کر میں اپنے ایک دوست مرزا فضل الدین احمد کے ساتھ جنہوں نے بعد میں میری کتاب "تذکرہ" شائع کی تھی، یہاں آیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا اس وقت یہ لائبریری "امپیریل لائبریری" کے نام سے مشہور تھی اور مٹکاف ہال میں قائم تھی۔

لائبریری سے استفادے کے لیے پہلے ایک اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ مرزا فضل الدین اپنے لیے یہ اجازت نامہ حاصل کر چکے تھے لیکن جب انہوں نے میرے لیے اجازت نامہ حاصل کرنا چاہا تو لائبریری اسسٹنٹ نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور میری عمر دریافت کی۔ میں نے کہا میری عمر تقریباً ۱۶ سال ہے۔ یہ سن کر اس نے مجھے اجازت نامہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ۱۸ سال سے کم عمر کے کسی لڑکے کو اجازت نامہ نہیں مل سکتا۔

مرزا فضل الدین نے ہر چند اسے مطمئن کرنا چاہا اور کہا کہ اگرچہ ان کی عمر یہی ہے لیکن یہ منطق، فلسفہ اور فقہ کے ایک استاد ہیں۔ اس لیے انہیں لائبریری سے استفادے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اور اگر ۱۸ سال سے کم عمر کے کسی نوجوان کے لیے لائبریری سے استفادے کی اجازت نہیں ہے تو انہیں اس قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے۔ میں نے لائبریری اسسٹنٹ کو دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ اس بیان کی صحت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ مرزا فضل الدین نے

Marfat.com

لائبریرین سے ملنا چاہا لیکن بدقسمتی سے وہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ لائبریری میں داخلے کی یہ میری پہلی کوشش تھی جسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور میں مایوس ہو کر لوٹ گیا تھا۔

چند سال کے بعد جب میرے ایک فاضل دوست ہری ناتھ دے لائبریرین ہوئے تو میرے لیے اس لائبریری سے استفادے کی رکاوٹ دور ہو گئی اور میں نے اس کے علمی ذخیرے سے بہت استفادہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ قاعدہ بعد میں رہا یا نہیں۔ لیکن میرے لئے اس لائبریری کی نہ صرف نادر کتابوں بلکہ بہت قیمتی مخطوطوں کے حصول میں بھی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ میں جب تک کسی چیز کو اپنے پاس رکھنا چاہتا، رکھتا اور جو چاہتا نقل کر لیتا۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے اس لائبریری کے افتتاح کا اعزاز حاصل ہوا ہے اور اس کے دروازے جو اب سے ۴۸ سال پہلے میرے لیے بند تھے علم و ادب کے تمام شائقین کے لیے کھول دیے جا رہے ہیں۔"

البیرونی سے مولانا کی دلچسپی ——— مولانا کے اس بیان سے قومی کتب خانے کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور نہ صرف مولانا کے علمی سوانح کا ایک ورق ہمارے مطالعے میں آتا ہے بلکہ البیرونی سے مولانا کی دلچسپی کی ابتدائی تاریخ کا سراغ بھی مل جاتا ہے۔ اب اس مقالے سے مولانا کے ابتدائی ذوق کی تاریخ پر مزید روشنی پڑتی ہے اور بعض نئی باتیں بھی علم میں آتی ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ البیرونی سے مولانا کی دلچسپی برائے نام ہی نہ تھی بلکہ البیرونی کی زندگی کے اہم واقعات، جغرافیے سے اس کے ذوق و انہماک، اس کی سیرت اور ذہن و فکر کے خصائص اور اس کے خاص میدان میں متقدمین اور متاخرین میں اس کے امتیازات پر ان کی گہری نظر تھی۔ مولانا نے اس مقالے میں ان مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔

"القانون" کا نسخہ کلکتہ ——— مقالے کے شروع میں ایک طویل بحث "القانون" کے مختلف نسخوں کے باب میں ہے۔ یہ وہ نسخے ہیں جو زکی ولیدی ٹوغان کے مطالعے میں آئے تھے ان میں سے جامع بایزید کے کتب خانہ ولی الدین آفندی کی صحت سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس لیے زکی ولیدی نے تصحیح و ترتیب کے لیے اسی کو بنیاد بنایا تھا۔ لیکن مولانا آزادؒ کی نظر سے کلکتہ کی امپیریل لائبریری کا نسخہ گذرا تھا، اس لیے سب سے زیادہ تفصیل اسی کے ضمن میں ملتی ہے۔ مولانا نے اس نسخے کی جہاں نوردی کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے کتب خانوں میں بھی اس کے دو نسخے پائے گئے ہیں، ایک امپیریل لائبریری کلکتہ میں ہے۔ دوسرا بمبئی کی ملا فیروز لائبریری میں ہے۔

امپیریل لائبریری کے نسخے کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ نسخہ ۵۶۲ھ میں ایک شخص ابوالفتح نصر بن محمد بن ہبۃ اللہ نے کسی دوسرے نسخے سے نقل کیا تھا۔ ۸۱۸ھ میں یہ نسخہ ایک شخص ادحد بن اسعد بن بہرام البیہقی کی ملکیت میں آیا۔ ادحد بن اسعد کے بعد یہ نسخہ مختلف شخصوں کے قبضے میں آیا اور انہوں نے اپنی اپنی مہریں اس پر ثبت کیں۔ لیکن اب یہ مہریں پڑھی نہیں جاتیں کیونکہ کسی شخص نے انہیں کوشش کر کے مٹا دیا ہے۔ پھر آخری صفحے میں دو مہریں صاف صاف نمایاں ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں ایک ہی نام درج ہے "فاضل خاں بندۂ شاہجہاں"۔ ان مہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں یہ نسخہ فاضل خاں کے پاس تھا۔ چونکہ اس فاضل خاں کے حالات سے ہم بے خبر نہیں ہیں اس لیے اس منزل پر پہنچ کر اس کے ورودِ ہند کا صحیح زمانہ متعین کر لیا جا سکتا ہے۔

فاضل خاں امرائے عہد میں ایک غیر معمولی دماغ کا شخص تھا اور یہ بات چونکہ مولانا آزاد کے خاص ذوق کی تھی۔ اس لیے مولانا نے اس کے فضائل کا تذکرہ تقریباً ایک صفحے میں بہت شوق سے کیا ہے۔ یہاں صرف چند باتیں درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"فاضل خاں کا نام علاء الملک تونی تھا۔ یہ شاہجہاں کے جلوس کے ساتویں سال ایران سے ہندوستان آیا اور اپنے فضل و کمال کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ صاحب مآثر الامراء نے اس کے حالات میں لکھا ہے کہ فنونِ حکمت طبیعی میں یکتائے روزگار تھا خصوصاً علم ہیئت و نجوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔"

"فاضل خاں لاولد تھا، لیکن اس کے بعض رشتہ دار فرخ سیر کے عہد تک مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ آخری منصب دار ملا ضیاء الدین تھا۔ جس نے فرخ سیر کے عزل کے بعد انتقال کیا۔ بہت ممکن ہے کہ اسی عہد میں اس کا کتب خانہ منتشر ہوا ہو۔

فاضل خاں کے خاندان کے قبضے سے نکل کر یہ کتاب مولوی صدرالدین احمد کے قبضے میں آئی۔ مولوی صدرالدین بہار ضلع بردوان (بنگال) کے رہنے والے تھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں علوم درسیہ کی تکمیل کی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں جب لارڈ کرزن نے امپیریل لائبریری قائم کی تو ان کے خاندان کے بعض ارکان نے اپنا خاندانی کتب خانہ گورنمنٹ کے

حوالہ کر دیا کہ لائبریری کی ایک شاخ کی صورت میں قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اس طرح یہ نسخہ امپیریل لائبریری کے قبضے میں آگیا۔ انسانوں کی طرح کتابوں کی زندگیوں کی بھی سرگزشتیں ہوتی ہیں۔ آٹھ صدیوں کی جہاں نوردی کے بعد یہ کتاب اب کلکتہ کی ایک عمارت میں مقیم ہے۔"

"القانون" کے نسخہ کلکتہ کی جہاں نوردی کی سرگزشت سنانے کے بعد اس کی صحت کے بارے میں مولانا نے خالص محققانہ انداز میں یہ فیصلہ فرمایا ہے:

"یہ نسخہ عرصہ تک میرے مطالعہ میں رہا ہے۔ عربی عبارت کی عام اغلاط اس میں کم ہیں، لیکن جہاں تک ہندوستانی ناموں کی تصحیف اور علمی مصطلحات و اعلام کے خبط و تغیر کا تعلق ہے، یہ نسخہ بھی یورپ کے نسخوں کی طرح ناقابلِ اعتماد ہے۔"

آگے چل کر بھی کئی مقامات پر مولانا نے اس قسم کے اشارات کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مولانا کے مطالعے میں رہا تھا اور اس کے خصائص پر مولانا کی نظر تھی۔ ایک مقام پر تو مولانا نے اس کے زیرِ مطالعہ آنے کا سال بھی بتا دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ نے کتاب الہند کی ایک تصریح سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ البیرونی کی حدودِ سیاحت ہندوستان میں ملتان اور لاہور سے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ چنانچہ اس وقت سے یہ بات بطور ایک مسلمہ واقعہ کے تسلیم کر لی گئی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ البیرونی نے ہندوستان میں سے صرف ملتان اور لاہور کو دیکھا تھا۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں جب مجھے "القانون المسعودی" کے نسخۂ امپیریل لائبریری کلکتہ کے مطالعہ کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ رائے نظرِ ثانی کی محتاج ہے، اب تو گان آفندی کے اس مجموعے کے مطالعے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ البیرونی کی سیاحت ہند کا دائرہ صرف پنجاب ہی میں محدود نہ تھا۔"

اس کے بعد "القانون" کے حوالے سے البیرونی کی سیاحت ہند کے دایرے کو لاہور و ملتان سے سندھ کے ساحل سمندر کے ایک مقام تک وسیع کر دیا ہے۔ صفۃ المعمورہ میں البیرونی کی "الصیدنہ" کا ایک اقتباس دیکھ کر انہیں خاص طور پر خوشی ہوئی اس لیے کہ اس سے سندھ کے سفر کا مزید ثبوت مل جاتا ہے۔ البتہ یہ عقدہ "الصیدنہ" کا حوالہ بھی کھولنے میں ناکام رہا کہ سندھ میں ساحل سمندر پر وہ کون سا مقام تھا جہاں ایک خاص رصدی عمل انجام دیا گیا تھا۔ البتہ اس کی سیاحت ہند کا زمانہ پوری طرح تاریخ کی روشنی میں آجاتا ہے۔ یہ سیاحت اس نے ۴۱۰ھ ہجری کے بعد کی اور تقریباً نو دس برس تک وہ پنجاب، کشمیر اور سندھ میں اپنے علمی مشاغل و تجارب میں مصروف رہا۔

مولانا کی ہمہ جہت شخصیت | مولانا آزاد کے اس تحقیقی مقالے کے مطالعے سے اندازہ کرلیا جاسکتا ہے کہ صرف زکی ولیدی کی کتاب پڑھ لینے سے مولانا کو البیرونی کے مطالعے کا شوق پیدا نہیں ہوگیا تھا بلکہ ۱۹۰۴ء یا اس سے بھی پہلے سے مولانا کے مطالعہ ونظر کا یہ موضوع تھا۔ اور البیرونی پر اس وقت تک ہندوستان میں جو کام ہوا تھا اس پر مولانا کی نظر تھی۔

اس کتاب میں مولانا آزاد کی ہمہ جہت علمی شخصیت کے متعدد پہلو اور سائنٹی فک مطالعے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ البیرونی کی متنوع شخصیت، اس کی دماغی سیرت اور اس کی علمی تحقیقات اور کارناموں پر یہ دلفریب مقالے کوئی ایسا شخص ہی لکھ سکتا تھا جس کا مطالعہ مذہبیات اور عربی ادب سے بڑھ کر تاریخ، جغرافیہ، نجوم، ہیئت اور ریاضی کے علوم اور ان کی تاریخ تک وسیع ہو۔ یہ مقالہ ایک ایسے جامع دماغ کی مثال بھی پیش کرتا ہے جو مطالب کے اخذ و ترتیب ہی کی عمدہ قابلیت نہیں رکھتا بلکہ وہ بے مثال حافظے کا مالک بھی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے مؤلف کے ذہن اور اس کے انداز تک کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ مختلف علمی و عملی مسائل میں مولانا کا دماغ کس طرح سائنٹی فک انداز میں کام کرتا تھا۔ مولانا کے اس سائنٹی فک مطالعے نے ان کے ذہن کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ ان کا ذہن حقایق و دقایق اور اصول و قواعد کا ایسا خوگر ہوگیا تھا کہ انسانی ذہن کے وہ افطار و اوہام اور دماغ کے وہ ظن و تخمین، جو لوگوں کو غلط روی اختیار کرنے اور اضطراب کے بستر پر تڑپانے کے لیے کافی ہوتے ہیں، مولانا کے ذہن میں معمولی سا ارتعاش بھی نہ پیدا کرسکتے تھے۔ یہ خوبی مولانا کے فکر اور سیرت میں ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔

البیرونی کا علمی مقام | مولانا آزاد نے اس کتاب میں البیرونی کے کام کی خوب داد دی ہے اور جغرافیہ و ہیئت کے علماء میں، نہ صرف متقدمین میں بلکہ معاصرین اور متاخرین میں بھی، اس کے امتیاز کو نمایاں کیا ہے اور اس کے کام کو ایک غیر معمولی عالم و محقق کے کام سے تعبیر کیا ہے لیکن وہ اس کی جس خوبی سے بہت زیادہ متاثر ہیں وہ اس کا اندازِ فکر و تحقیق ہے۔ مولانا اس کی تحقیقات سے زیادہ اس کی دماغی سیرت کے مداح ہیں۔ انہوں نے اس کے نتائج تحقیق سے کئی جگہ پر اختلاف کیا ہے لیکن اس کی دماغی خوبی اور اس کی سائنٹی فک اپروچ کے بیان میں وہ ہر جگہ رطب اللسان ہیں۔ اس کتاب میں متعدد مقامات پر انہوں نے اس کی اعلیٰ دماغی کی خوب خوب تحسین کی ہے۔ ایک جگہ اس کے دماغی خصائص کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ "وہ ایک محقق اور مجتہد تھا۔ اس نے قدما کی تحقیقات کو نقل کردینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق و کاوش سے جغرافیہ کے فن کو از سرِ نو مدون کردیا۔" (ص ۴۴)

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ اس نے وسط ایشیا، افغانستان، چین اور ہندوستان کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا

Marfat.com

کیں اور ہر اہم مقام کی نسبت سائنٹی فک طریقے سے جس قدر رصدی تحقیقات کی جا سکتی تھیں وہ سب انجام دیں' ایک مقام پر "البیرونی کا علمی کارنامہ" کے عنوان سے اس کی خدمات، ان کی نوعیت اور خصائص پر دفعہ دار روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے البیرونی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ قرار دی ہے کہ اپنی تحقیقات کے ہر گوشے میں وہ ایک خالص سائنٹی فک معیارِ نظر سے ہر بات کو تولتا ہے اور کسی دوسرے غیر علمی عنصر کا اثر قبول کرنے سے قطعاً منکر ہے۔ اس نے ہر طرح کی وہم پرستیوں اور مذہبی زد و اعتقادیوں کے خیالات سے جغرافیائی معلومات کو یک قلم پاک کر دیا (ص ۶۴) آگے چل کر البیرونی کی اس خصوصیت پر انہوں نے مزید روشنی ان الفاظ میں ڈالی ہے:

"البیرونی فنِ جغرافیہ کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں پہلا شخص ہے جس نے قدماء کے یہ تمام نقائص صحتِ نظر کے ساتھ معلوم کیے اور پھر صحتِ رصد و مشاہدہ کے ساتھ انہیں دور کر کے جغرافیہ کو ٹھوس سائنٹی فک بنیادوں پر جما دیا' اسے قدماء سے جو کچھ ملا تھا وہ شکوک و اختلافات سے آلودہ تھا اور تخمین و قیاس کی پابندیوں سے قدم قدم پر رکاوٹیں حایل ہو گئیں تھیں۔ اس نے اپنے بعد کے زمانے کے لیے جو کچھ چھوڑا وہ نہ صرف اختلافات و شکوک کی آلودگیوں سے پاک ہو چکا تھا بلکہ تخمین و قیاسات کی پابندیوں سے بھی آزاد تھا' خالص عقلی نظر و استدلال اور بے میل رصد و مشاہدہ اس کی تمام جغرافیائی سرگرمیوں کا غیر متزلزل معیارِ عمل رہا اور یہی اس کے علمی کارناموں کی اصلی خصوصیت ہے۔" (ص ۷۲)

مولانا کو اس راہ کی مشکلات کا بھی اندازہ تھا چنانچہ آگے چل کر جہاں مولانا نے موجودہ زمانے اور البیرونی کے رصد و مشاہدہ کے مطابق مختلف شہروں کے عروض و اطوال کے فرق کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ اس نے غزنی، کابل، جلال آباد، لمغان، پشاور، وے ہند، جہلم، قلعہ نندنہ، ملتان، سیالکوٹ وغیرہ کے جو عروض و اطوال تحریر کیے ہیں ان میں اور موجودہ زمانے کی تحقیقات و تعینات میں بہت تھوڑے درجوں کا فرق ہے۔ اس فرق کے لیے مولانا نے البیرونی کا دفاع کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تمام عروض و اطوال اس کے ذاتی رصد و مشاہدہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتے' اس نے ہندوستان کے راویوں اور سیاحوں کے بیانات کو لیا ہو گا اور بلاشبہ اس کے سائنٹی فک دماغ نے روایتوں کی جانچ پڑتال میں کمی نہیں کی ہو گی لیکن معاملہ کی نوعیت ایسی تھی کہ بغیر ذاتی رصد و مشاہدہ کے حقیقتِ حال کا علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کتاب الہند میں خود کہتا ہے کہ ہندوستان کے راویوں اور سیاحوں کے بیانات سے حقیقت حال کا علم حاصل کرنا نہایت درجہ دشوار ہے۔ ان کے بیانات طرح طرح کی غلط فہمیوں، وہم پرستیوں اور مبالغہ آرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور سامع کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ

Marfat.com

روایت کا کتنا حصہ اوہام و خرافات پر مبنی ہے اور کتنا حقائق نفس الامری پر (ص ۸۷) یہ بات چونکہ مولانا کے خاص ذوق کی تھی اس لیے انھوں نے بار بار اور اسلوب بدل بدل کر اسے بیان کیا ہے۔ اس سے آگے "البیرونی کی دماغی سیرت" کے عنوان سے ایک مستقل باب میں اس بحث کو پھر چھیڑ دیا ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"البیرونی کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا بے لاگ علمی یعنی سائنٹفک دماغ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہر جگہ اس کے ساتھ آتی ہے۔ کوئی دینی عقیدہ، کوئی قومی روایت کوئی تاریخی مسلمہ اس کی اس خصوصیت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقلیت بے لچک، بے داغ اور ناممکن التسخیر ہے۔ (ص ۱۰۵)

البیرونی کی اس خصوصیت کو ثابت کرنے کے لیے کتاب الصیدنہ اور الجماہر فی معرفۃ الجواہر سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ آخر میں ایک ماہر طبعیات منصور بن طلحہ کے بارے میں اس کا ایک بیان نقل کیا ہے اور اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"صرف یہی ایک مثال اس کے لیے کافی ہے کہ البیرونی کا دماغ اپنے علمی فیصلوں میں کس درجہ محتاط تھا اور کس طرح ہر معاملے کو بے لاگ علمی اور خالص عقلی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔" (ص ۱۱۱)

البیرونی کا امتیاز مولانا نے البیرونی کے امتیاز اور عظمتِ علمی کو اس طرح بھی نمایاں کیا ہے کہ محققین ماقبل بطلیموس (ف ۸۷ تا ۱۶۵ء) الاصطخری (چوتھی صدی ہجری) الادریسی (۱۱۰۰ - ۶۶) الہمدانی (ا) ابن خردازبہ (۹۱۲ - ۸۲۶ء) اور محققین مابعد الیاقوت (ابو عبداللہ شہاب الدین پ ۱۱۷۵ء) طوسی (نصیر الدین ۷۴ - ۱۲۰۱ء)، قزوینی (زکریا بن محمد، ۸۳ - ۱۲۰۴ء) ابوالفدا (۱۳۳۱ - ۱۲۷۳ء)، الغ بیگ (۱۴۴۹ - ۱۳۹۳ء)، قوشجی ( ) وغیرہ کے کاموں اور کارناموں سے موازنہ کرکے البیرونی کے دماغ اور اس کے کاموں کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور بعض دوسرے علوم کے متخصصین کی مثالیں دے کر البیرونی کی محققانہ اور مجتہدانہ نظر و بصیرت کا نقش ابھار کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے ابوالنصر فارابی (۹۵۰ - ۸۷۰ء) اور ابن رشد (۱۱۹۸ - ۱۱۲۶ء) سے خاص طور پر مثال دی ہے۔ کہ جس طرح یونانی تراجم کی نظر ثانی ابوالنصر فارابی نے کی ابن رشد نے ارسطو کے مقالات کی

ا الہمدانی (بدیع الزماں) ۱۰۰۷ - ۹۶۹ء) صرف شاعر تھا۔ البتہ الہمدانی (القاسم ابن محمد ابن ہشام اور ابو محمد الحسن ابن احمد بن یعقوب) کے عرف سے دسویں صدی عیسوی میں دو شخص گزرے ہیں۔ مولانا آزاد کا اشارہ شاید انہی دو میں سے کسی کی طرف ہو۔

Marfat.com

شرحیں لکھ کر ان کے مطالب واضح کیے اور یونانی طب کو منقح مہذب کر کے اپنی کتاب "القانون" کو ازمنہ وسطیٰ کے درس و تدریس کے لیے پیش کر دیا اسی طرح ہندی علوم کی اصلاح و تہذیب کے لیے بھی ایک ابو النصر اور ابن رشد کی جگہ خالی رہ گئی تھی یہ کارنامہ البیرونی نے انجام دیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو البیرونی کی شخصیت میں اس کے عہد کی یہ علمی روح پوری طرح نمایاں ہوئی تھی اور وہ بجا طور پر الفارابی اور ابن الرشد کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ہے جس طرح ان دونوں نے یونانی فلسفہ کے تراجم کی تصحیح کا کام انجام دیا تھا اسی طرح البیرونی نے علم ہیئت اور جغرافیہ کی از سر نو تصحیح و تہذیب کی اور ہندوستانی علوم کو نئے سرے سے عربی میں مدون کیا۔ لیکن البیرونی اس صف میں نمایاں ہونے کے ساتھ اپنی ایک بلند تر جگہ بھی رکھتا ہے۔ ابو النصر فارابی اور ابن الرشد دونوں اس زبان سے ناواقف تھے جس زبان کے فلسفے کی تصحیح و تہذیب میں مشغول ہوئے تھے۔ انہوں نے تمام تر اعتماد عربی کے قدیم تراجم پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصحیح مکمل تصحیح نہ ہو سکی اور بعض غلط فہمیاں جو عہد تراجم کے ابتدائی دور میں پیدا ہو گئی تھیں آخر تک دور نہ ہو سکیں ..... لیکن البیرونی نے نظر و تحقیق کی بالکل دوسری راہ اختیار کی۔ اس نے جن علوم کو اپنا موضوع نظر قرار دیا انھیں خود ان کی اصلی زبانوں میں پڑھنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے علوم کی اس نے جس قدر تحقیقات کی سنسکرت کی تحصیل کے بعد کی۔ فارسی، خوارزمی اور جرجانی زبانیں اس کے لیے بمنزلہ مادری زبانوں کے تھیں۔ اس لیے قدیم ایرانی تاریخ و سنین کی تحقیقات میں اسے کسی درمیانی وسیلے کا منت پذیر نہیں ہونا پڑا۔ جہاں تک یونانی اور سریانی زبانوں کا تعلق ہے گو کوئی براہِ راست تصریح ہمیں نہیں ملی ہے لیکن الآثار الباقیہ میں اس نے اپنی تحقیقات کا جس پیرایے میں ذکر کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ غالباً وہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف نہ تھا۔ عبرانی زبان سے اس کی ذاتی واقفیت کی تصریح خود اس کے قلم سے نکلی ہوئی ہمیں مل گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص سنسکرت، یونانی، سریانی، فارسی اور عبرانی زبانوں سے براہِ راست واقفیت رکھتا ہو اس کی علمی حیثیت کے مقابلے میں الفارابی بوعلی سینا اور ابن الرشد وغیرہم کو لانا کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان اکابر کا علمی پایہ کتنا ہی بلند ہو تاہم ان کا تمام علمی سرمایہ عربی ترجموں کے رحم پر تھا۔ وہ براہ راست نظر و تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی

Marfat.com

شبہ نہیں کہ عربی کی پوری علمی تاریخ میں البیرونی کا مقام یک قلم منفرد نظر آتا ہے:: (صفحہ ۶۴)

البیرونی کے بعض تسامحات مولانا آزاد نے اس مقالے میں البیرونی کے کارناموں کی صرف تعریف ہی نہیں کی بلکہ اس کے بعض تسامحات پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن اس باب میں انھوں نے البیرونی کی معذوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس کی معذوری کی اصل وجہ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ان توہمات و خرافات کو بھی قرار دیا ہے جنھوں نے مسلمات کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور سیر و سیاحت کی معلومات اور رصد و مشاہدہ کے وسائل کی کمی بعض قیاسات کو بھی قرار دیا ہے۔ مثلاً سیلون کے قبۃ الارض ہونے کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمی میں البیرونی کے مبتلا ہو جانے کا ذکر کیا ہے مولانا لکھتے ہیں:

"عربی میں چونکہ فلکیات کے مباحث پہلے پہل ہندی علم ہیئت کے دروازے سے آئے تھے اور دوسری صدی ہجری میں موسیٰ بن محمد الخوارزمی نے برہم گپت کی سدھانت کے مطابق علم ہیئت کے مباحث ترتیب دیے تھے اس لیے یہ غلطی عربوں میں بھی پھیل گئی اور انھوں نے سیلون کو قبۃ الارض کے نام سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔ البیرونی نے اگرچہ سیلون کے قبۃ الارض ہونے میں شبہ ظاہر کیا ہے اور اس بارے میں جو توہمات ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے انھیں خرافات سے تعبیر کیا ہے تاہم حساب کی اصلی غلطی پر وہ بھی متنبہ نہ ہو سکا کیونکہ اس زمانے میں سیر و سیاحت کے وسائل اور رصدی اعمال کے طریقے اس درجہ محدود تھے کہ اس طرح کی غلطیوں کی درستگی بآسانی نہیں کی جا سکتی تھی۔" (۷۹)

مولانا نے البیرونی طول بلد اور عرض بلد کے بعض تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن اس کا سبب بھی بتا دیا ہے:

"ایک بڑی دشواری اُسے یہ پیش آئی کہ ہندوستان کے شہروں کی باہمی مسافت کی نسبت راویوں کے بیانات بے حد مختلف تھے اور جمع و تطبیق کا کوئی قابلِ وثوق ذریعہ موجود نہ تھا..... اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ طرح طرح کی غلطیاں حساب میں سرایت کر جائیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی غیر معمولی کوشش و احتیاط بھی اسے صورتِ حال کے قدرتی نقایص سے نہ بچا سکی اور مساحت کے اندازوں میں غلطیاں واقع ہو گئیں۔ مثلاً موجودہ پٹنہ تقریباً اسی محل پر واقع ہے جہاں قدیم عہد کا پاٹلی پتر آباد تھا۔ پٹنہ کا طول بلد ۸۵ - ۱۲ اور عرض بلد ۲۵ - ۳۷ ہے۔ البیرونی پاٹلی پتر کا طول بلد ۱۰۸ - ۲۰ لکھتا ہے اور عرض بلد ۲۲ - ۳۰، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں جو روایتیں اس تک پہنچی تھیں وہ اصلیت کو صحت

Marfat.com

کے راستہ واضح نہیں کرتی تھیں۔ اس نے بنارس سے پاٹلی پتر تک کا فاصلہ بیس فرسخ عربی قرار دیا ہے اور بنارس سے اسے یورپ میں ہٹا ہوا تصور کیا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں صحت سے دور ہیں۔ ایسا ہی فرق گنگا ساگر کے محل وقوع میں بھی پڑ گیا۔ کیونکہ صحیح فاصلہ اور صحیح جہت اس کے علم میں نہ آسکی۔" (ص ۸۷)

البیرونی کے تسامحات کے سلسلے میں مولانا نے سیلون کے بارے میں کتاب الہند باب ۳۰ کی مثال دی ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کے لوگوں کے دماغوں میں پرانوں اور رامائن کی کہانیوں نے ایسا رسوخ حاصل کر لیا تھا کہ نہ صرف عام لوگوں کا بلکہ پنڈتوں تک کا عام خیال یہی تھا کہ لنکا میں عفریت بستے ہیں اور انسان کا وہاں جا کر زندہ واپس آنا بہت دشوار ہے۔ اس وقت تک عرب سیاحوں کے قدم بھی سیلون کی سیر و سیاحت سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ وہ اسے سنگل دیپ کے نام پر پہچانتے تھے اور اس کے ساحل سے گزرتے ہوئے ساحلی مقامات کی بعض پیداوار بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن وہاں کے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوئی صورت اس وقت تک نہ نکلی تھی اس لیے افسانوی روایات ان میں بھی پھیل گئی تھیں اور وہ ہند و افسانے کے متوہم قلعے کے بارے میں خیال کرتے تھے کہ وہ اسی مقام کے کسی حصے میں ہے۔ البیرونی ان افسانوں سے جو تاریخ کے مسلمات کی طرح مشہور تھے، دھوکے میں پڑ گیا مولانا لکھتے ہیں:

"البیرونی نے عرب سیاحوں کی زبانی ایک اور پر اسرار جزیرے کا حال نقل کیا ہے جہاں سے وہ اپنے جہازوں پر لونگ (قرنفل) بار کیا کرتے تھے اور پھر لکھا ہے عجب نہیں وہی جزیرہ لنکا ہو اور پھر لنکا اور لونگ کی لفظی مناسبت سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ "لونگ" "لنکا" سے مشتق ہوا ہے۔ حالانکہ "لونگ" کو لنکا سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کتاب الہند کے اسی باب میں ہند و افسانے کے متخیلہ قلعے کا جس کی کوئی اصلیت نہ تھی، ایک نقشہ بھی دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندو افسانوں میں لنکا اور سنگل دیپ کو دو الگ الگ مقاموں کی شکل دی گئی ہے اس نے القانون کی جدول میں لنکا اور سنگل دیپ کے لیے دو مختلف درجے متعین کیے ہیں جو جدول خط استواء بلد عرض کے مقامات کی بنائی ہے، اس میں لنکا کا طول بلد ۱۰۰ لکھا ہے۔ پھر ان مقامات کی جدول میں، جو اقلیم اول اور خط استوا کے درمیان واقع ہیں، سنگل دیپ اور سراندیپ کا ذکر کیا ہے اور اس کا طول بلد ۱۲۰ اور عرض بلد ۱۰ درجے کا لکھا ہے۔ وہ لنکا کو مجہولات میں سے قرار دیتا ہے۔ مگر سنگل دیپ کو مجہول نہیں کہتا۔ اسے بحر ہرکند کے

Marfat.com

جزایر میں شمار کرتا ہے۔ بہرحال وہ اس مقام کی صحیح تحقیق نہ کرسکا۔" (۸۰)

ایک اور مقام پر "سندہند" کی اصل سمجھنے میں البیرونی کے تسامح کی طرف بھی مولانا نے توجہ دلائی ہے۔ اس موقع پر لسانیات کی ایک چھوٹی سی تحقیق بھی مولانا نے پیش کردی ہے۔ اور اس قسم کی تحقیق کی یہ کوئی واحد مثال نہیں۔ متعدد مقامات پر اس قسم کی تحقیقات سامنے آتی ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"سندھانت کے معنے سنسکرت میں علم و معرفت کے ہیں۔ نیز اس کا اطلاق علم و فن کے کسی خاص مذہب اور اصول پر بھی ہوتا ہے۔ پس "براہم سپھت سندھانت" کے معنے ہوئے علم ہیئت کا وہ مذہب جو براہم گپت کی طرف منسوب ہے۔ عربوں نے نام کا بقیہ جزء حزف کردیا اور پھر "سدھانت" کو جس کی مخلوط دال ان کی زبان کے لیے بہت ثقیل تھی "سندہند" بنالیا۔ البیرونی پر اس لفظ کی اصلیت مشتبہ ہوگئی تھی۔ اس کا خیال "سدھانت" کی طرف نہیں گیا بلکہ ایک دوسرے سنسکرت مادے "سدھانڈ" کی طرف چلا گیا۔ سدھانڈ کے معنی استقامت یعنی سیدھے ہونے کے ہیں اور اسی سے ہراکرت زبانوں میں "سیدھ" اور "سیدھے" کا لفظ بنا ہے۔ چنانچہ کتاب الہند میں وہ لکھتا ہے کہ عربوں میں "سندہند" کے نام سے جو مذہب مشہور ہوا وہ دراصل "سدھانڈ" ہے یعنی ایسی بات جس میں کسی طرح کی کجی نہ ہو۔" (ص ۵۶)

اسی طرح ہندوستان کے مقام "اجین" کے عربی تلفظ اور تصحیف کے عمل سے مطالب کے فہم میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں حتیٰ کہ ایک وقت آیا جب اس کے معنی یکسر بدل گئے۔ مولانا نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

بعض مباحث کی تحقیق | مولانا نے البیرونی کی زندگی کے بعض حوادث و مصائب سے متعلق اس کے اشارات کی وضاحت اور ان کی تحقیق بھی کی ہے مثلاً ہندوستان میں اس کے مقامات سفر و سیاحت اور محمود غزنوی سے اس کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔

بعض مقامات پر مولانا نے البیرونی کے بیان کو نقل کردینے یا اس کی خصوصیت کی طرف صرف توجہ دلانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس پر مزید اضافہ بھی کیا ہے اور مدلل و مبرہن کردیا ہے۔ اسی قسم کا ایک مقام "سنگ بدہ" کی بحث میں آتا ہے۔ البیرونی نے اس مسئلے پر جو کچھ لکھا مولانا نے اس کے تعارف کی تمہید میں ایک بحث کا اضافہ کیا ہے۔ اب یہ ایک مختصر سا مستقل مبحث اس مقالے میں ہے جس سے اس مسئلے کے اطراف و جوانب سامنے آجاتے ہیں۔

مولانا کا حسنِ نگارش | مولانا آزاد کے اس مقالے میں اگرچہ ان کا قلم علمی مباحث کے زیر اثر رک رک کر چلا ہے اور انشاپردازی کا حسن اگرچہ غبارِ خاطر کے درجے کو نہیں پہنچتا لیکن ان کے قلم کی

Marfat.com

ندرت کاری کا عالم یہ ہے اور اسلوب کی جلوہ طرازی ایسی ہے کہ وہ نگاہِ جمال آشنا اور دیدۂ حسن پرست کو بار بار اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ اس مقالے سے اس کی چھوٹی بڑی بہت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ "جو مایوسی ایلیٹ کے حصے میں آئی تھی وہ آگے چل کر ان تمام مستشرقوں کے حصے میں آنے والی تھی جو ایلیٹ کے نقشِ قدم پر اٹھانے والے تھے۔" (ص ۴۵)

۲۔ "بطلیموس کے جغرافیہ کی تدوین کے بعد طرح طرح کے انقلابوں سے دنیا دوچار ہوئی بہت سے پرانے شہر مٹ گئے اور ان کی جگہ نئے نئے شہر آباد ہو گئے۔ بعض دریاؤں کی دھاروں نے اپنی قدیم راہیں بدل دیں اور نئی نئی راہوں پر چلنے لگے۔ اسلام کے ظہور کے بعد انقلابِ حال نے ایک دوسرا ورق الٹا اور ایشیا اور افریقہ کی بہت سی آبادیاں کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ عراق میں قدیم ایرانی شہنشاہی کا دارالحکومت ویران ہو گیا اور بصرہ، کوفہ اور بغداد کے ناموں سے نئے شہر بس گئے۔ مصر میں "منفس" کی جگہ "فسطاط" نے لی اور ایران میں "استخر" کی جگہ شیرازہ نے سر اٹھایا، مراکش، اسپین، وسط ایشیا اور سندھ میں بھی نئی عربی نوآبادیاں نمایاں ہوئیں اور جغرافیہ کے نقشوں میں بے شمار نئے مقامات اور نئے نام پیدا ہو گئے۔ ان آبادیوں کے جغرافیائی محل کا تعین قدیم یونانی معلومات نہیں کر سکتی تھیں اور ضروری تھا کہ نئی تحقیقات کے ذریعے ان کے اطوال و عروض متعین کیے جائیں۔" (ص ۷۲)

۳۔ "البیرونی نے اپنی علمی جد و جہد ہر طرح کے موافق و مخالف حالات میں یکساں عزم و ہمت کے ساتھ جاری رکھی اور وقت کا کوئی ہنگامہ اس کے ذوقِ تحقیق کی طلب گاریوں پر غالب نہ آ سکا۔" (ص ۹۱)

۴۔ جس وقت خوارزم کی سرزمین قتل و نہب کا یہ کھیل کھیل رہی تھی۔ البیرونی اس کی آبادیوں کے باہر ایک گاؤں کے میدان میں اپنی رصد بندیوں کے پرسکون اعمال میں مشغول تھا جس دن امیر مامون نے کاث کے شاہی محل میں ابو عبداللہ کو گرفتار کیا اسی دن البیرونی نے اپنی رصد گاہ کو ایک نئے دائرۂ قطر اور اس کے متعلقہ آلات سے آراستہ کیا تھا اور زمانے سے صرف اتنی مہلت کا آرزو مند تھا کہ اسے اپنے رصدی عملیہ کے نتائج قلم بند کرنے کا موقع مل جائے۔ وما احسن ما قیل بالفارسیہ،

نہ گویم اے فلک کز کجروی ہا یت تو برگردی
شب وصل ست خواہم ایں قدر آہستہ تر گردی

Marfat.com

لیکن افسوس ہے زمانے کے بے رحم انقلابات نے اسے اتنی مہلت بھی نہ دی۔" (ص ۹۲)

۵۔ علوم فلکیہ کی تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ علم ہیئت اور فنِ نجوم یعنی سعادت و نحوست کواکب کے فن کا باہمی فرق مدتوں تک غیر واضح رہا۔ جو امتیازی خط دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے، وہ قدیم زمانے میں اتنا باریک تھا کہ عام نگاہیں بہت کم اسے محسوس کر سکتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہیئت کے ماہر کو فنِ نجوم کا ماہر سمجھ لیا جاتا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابو محمود الخجندی ابن جابر البتانی، ابو معشر الفلکی، عمر الخیام، نصیر الدین الطوسی وغیرہم جنھیں فنِ نجوم کے اوہام و خرافات سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا محض اس لیے نجومی مشہور ہو گئے کہ لوگوں نے ان کی نگاہیں ستاروں کی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں تھیں اور وہ خیال کرتے تھے کہ ستاروں کی حرکات کا مطالعہ صرف اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ فنِ نجوم کا اعتقاد اسی رُخ پر لے جاتا ہے۔ نظامی سمرقندی اور صاحب نگارستان نے البیرونی کی نسبت جو حکایتیں لکھی ہیں ان کے اندر بھی یہی غلط فہمی کام کر رہی ہے۔ البیرونی کے بے لاگ علمی دماغ کا تو یہ حال تھا کہ جس شخص کو ریاضی و ہیئت کے ساتھ فنِ نجوم کے اعمال و احکام سے بھی دلچسپی ہوتی وہ اس کے بیانات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا کیونکہ وہ خیال کرتا کہ بہت ممکن ہے فنِ نجوم کے عقیدے سے اس کا رصدی عمل غیر محسوس طریقے پر متاثر ہو گیا ہو۔ چنانچہ اس نے نیشاپور کے طول بلد کی بحث میں منصور بن طلحہ کی تصریح کو صرف اس لیے مشکوک ٹھہرایا کہ "کان مولعاً بعلم النجوم" وہ علم نجوم سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن زمانے کی غلط اندیشیوں کا یہ تصرف دیدنی ہے کہ ایسا محتاط شخص بھی نجومی ہونے کے اہتمام سے محفوظ نہ رہ سکا، وللّٰہ درما قال،

مریم اینِ را متحمل شد عیسیٰ برداشت (ص ۹۸)

۶۔ یہ روایت کہ سلطان محمود نے البیرونی کی جان بخشی اس کے نجومی ہونے کے خیال سے کی صحیح ہو یا نہ ہو لیکن سلطان کی دماغی استعداد پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ البیرونی کے علمی مقام کی اندازہ شناسی کے لیے وہ قطعاً غیر مستعد تھا اور اس کے فلکی اعمال و انہماک کو صرف اسی صورت میں دیکھ سکتا تھا کہ اُسے نجومی تصور کر لے۔ اس سے زیادہ — — — — — —۔ کے لیے اس کے پاس کوئی دماغی استعداد نہ تھی۔ اس صورتِ حال میں بھی ہمیں البیرونی کے احساسات کی تلخی اور مایوسی صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ ایک ایسے بادشاہ کی سرپرستی اسے کیونکر مطمئن اور خوشحال کر سکتی تھی جو ریاضیات اور ہیئت کے ایک باکمال شخص کی قدر شناسی کے لیے کوئی ذہنی استعداد نہیں رکھتا تھا اور اگر قدر شناسی کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو صرف اس لیے

Marfat.com

کہ اسے فنِ نجوم کے اوہام و خرافات کے اعتقاد سے متہم تصور کرلے۔ (ص ۹۹)

مولانا کا حسن ترجمہ | اس مقالے میں حسن ترجمہ کی بھی متعدد مثالیں سامنے آتی ہیں۔ مولانا آزاد کے ندرہ کار قلم سے عربی کی طویل طویل عبارتوں کا ترجمہ جگہ جگہ پر اس مقالے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ترجمے میں چونکہ قلم دوسرے کے فکر و مفہوم اور اسلوب کا پابند ہوتا ہے اس لیے ترجمے کے تقاضوں سے عہدہ برا ہوتے ہوئے انشا پردازی کا میدان تنگ رہتا ہے اور کوئی ایسا مترجم جو بیک وقت اور یکساں طور پر دونوں زبانوں کا ذوق آشنا نہ ہو اور نظر و عبور میں اپنا ایک بلند مقام نہ رکھتا ہو، کامیاب نہیں ہوتا۔ وہ فکر و مفہوم پر نظر رکھتا ہے تو سررشتہ اسلوب و نگارش ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ترجمہ کی زبان کے اسلوب و انشا کے حسن و زیبائش کو توجہ کا مرکز بناتا ہے تو مصنف کے فکر و مفہوم اور اسلوب سے دور جا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں بہت کم ادیب کامیاب ہوتے ہیں مولانا آزاد کا شمار ان مستثنیٰ شخصیات میں ہوتا ہے جو ایک مصنف کے افکار و مفہوم کی صحیح ترجمانی کے ساتھ اسلوب کے معیار اور نگارش کے حسن کو بھی ترجمہ کی زبان میں نہ صرف برقرار رکھتے ہیں بلکہ اسے چار چاند لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے اسلوب کی سحر انگیزی اور نگارش کی دل آویزی کا جو عالم ہم ان کی تحریر میں دیکھتے ہیں وہ ترجمے میں بھی موجود ہے۔

بعض ضمنی مباحث | اصل مباحث کے علاوہ بے شمار ضمنی افکار و مباحث بھی اس مقالے میں آگئے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے افکار بھی ہیں کہ مولانا کی کسی اور تحریر میں ان کی تلاش بے سود ہے۔ مثلاً ترکی میں قومی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کے اقدام کی سنگینی پر تبصرے میں مولانا کے فکر کا جو گوشہ پہلی بار تاریخ کی روشنی میں آیا ہے، یا کم از کم میرے مطالعے کے سفر میں یہ مقام پہلی بار میری نظروں نے دیکھا اس کے چند جملوں میں عبرت اور سبق آموزی کے کتنے ہی دفتر سمٹ آئے ہیں۔

"حکومت ترکی نے حروف کی تبدیلی کا فیصلہ جن اصلاحی مقاصد کے ماتحت کیا اس کی نسبت یہاں اظہار رائے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کوئی اصلاح کتنی ہی اہم ہو اگر اس کے غلو کو مجنونانہ انتہا تک پہنچا دیا جائے گا تو وہ اصلاح نہیں رہے گی بجائے خود ایک افسادین جائے گی۔ حروف کی تبدیلی کا کام بغیر اس کے بھی انجام پا سکتا تھا کہ عربی حروف ملک سے جلاوطن نہ کر دیے جاتے اور عربی کتابوں کی طباعت کو جرم نہ قرار دیا جاتا۔" (ص ۵۴)

اسی طرح استنبول اور قونیہ کے کتب خانوں کی تاریخ، ان کے انتشار کی کہانی، پھر دوبارہ ان کی ترتیب و روداد کی جو تفصیلات مولانا نے بیان کی ہیں۔ وہ اس کتاب کے موضوع سے الگ ایک مستقل اور دلچسپ موضوع ہے۔ اسی طرح البیرونی کی القانون المسعودی کی جدول کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے

136086

Marfat.com

مولانا نے البیرونی سے پہلے عربی میں فن جغرافیہ اور علم ہیئت کے آغاز و ارتقاء پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے بغیر البیرونی کی تحقیقات کی علمی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں عربی میں ہیئت کی پہلی کتاب، اس کی تصنیف حیثیت، اس کے مباحث، اس کی خصوصیات، اس کی غلطیاں، ہندوستانی کلپ کا حساب، ہندی بگ اور نہایگ، قبۃ الارض کی بحث، علم ہیئت کی مختلف شاخوں میں کام کا ذکر، عربی میں دنیا کے پہلے نقشے کی تشکیل اور اس کی خصوصیات کا ذکر اور ہندی حساب کی غلطیاں، یہ تمام مباحث ایسے ہیں، جو اس مقالے کو ایک خاص معیار کی تحقیق اور تصنیف کا کارنامہ بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح علوم فلکیہ کی تاریخ کی یہ غلط فہمی کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جن کا تعلق علم نجوم سے نہ تھا انھیں نجومی سمجھ لیا گیا۔ اس بحث کا تعلق بھی مقالے کے خاص دایرے سے نہ تھا لیکن مولانا کے قلم کی یہ خصوصیت کہ وہ دورانِ بحث میں اصل بحث کے علاوہ بہت سے ضمنی و ذیلی مباحث پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور آخر میں بحث کے تمام اطراف و جوانب کو سمیٹ کر اسی نقطے پر لے آتے ہیں جسے وہ پہلے سے اپنے مقاصدِ تحریر کا مرکز قرار دے چکے ہوتے ہیں، اس مقالے میں مولانا کی یہ خوبی متعدد مقامات پر نمایاں ہوئی ہے۔ مولانا نے بحث کو مختلف گوشوں اور سمتوں میں پھیلا پھیلا کر سمیٹ لیا ہے اور قاری کے ذہن میں مطالب کے شیرازے کو کہیں جگہ کھیر دینے کے باوجود بحث کے اصل نقطے کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔

اصطلاحات کا استعمال: کسی علم و فن کی کتاب میں اصطلاحات کے استعمال سے اسلوب میں ایجاز و اختصار کا حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن ایک مصنف کے نظر و عبور کی یہ آزمایش گاہ بھی ہے۔ ایک اصطلاح کا غلط یا خلاف محل استعمال تمام مطالب کو خبط کر دینے کے لیے بھی کافی ہوتا ہے۔ اس مقالے میں اصطلاحات کا استعمال مولانا کے اسلوب کی خوبی اور نظر و عبور کے ثبوت کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا کو جغرافیہ اور ہیئت سے شروع ہی سے دلچسپی تھی اور زندگی کے بعد کے کسی دور میں بھی شاید ہی وہ ان علوم کے مطالعے سے بے نیاز رہے ہوں۔ اس کا اندازہ کچھ اس مقالے کے مطالعے ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا نے جغرافیہ کی بہت سی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نہایت صحت کے ساتھ اور بر محل استعمال کیا ہے۔ مولانا کی اس خوبی نے مقالے میں ایک خاص علمی شان پیدا کر دی ہے اس سے اسلوب میں ایجاز کا حسن اور دل ربائی کی خوبی بھی بڑھ گئی ہے۔

آخری نظر: البیرونی کے بارے میں مولانا کی یہ پہلی اور آخری تحریر نہیں۔ جس طرح مولانا کا مطالعہ ان کی پوری زندگی میں پھیلا ہے اور ادبی زندگی کے آغاز سے آخر دورِ حیات تک البیرونی اور

Marfat.com

اس کے علوم وافکار مولانا کے مطالعے کا موضوع رہے ہیں اسی طرح اس کا تذکرہ بھی مولانا کے قلم سے مختلف ادوارِ حیات میں ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں البیرونی کی تصنیف "القانون المسعودیؒ" کے مطالعے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں لیکن اس کے لیے انھیں کامل دو سال کے شب و روز کا شمار کرنا پڑا پھر جب انتظار کی یہ مدت پوری ہوئی تو کتب خانے میں لائبریرین کی حیثیت سے ان کے ایک دوست بھی آچکے تھے۔ یہ دورِ انتظار و التوا ختم ہوا تب ۱۹۰۶ء میں "القانون" مولانا کے مطالعے میں آئی ایک مدت تک ان کے پاس رہی۔ "الہلال" کی مجلدات میں متعدد مضامین میں البیرونی اور اس کے علوم وافکار کا ذکر یا حوالہ آیا ہے۔ سب سے آخر میں مولانا کے ادبی شاہکار غبارِ خاطر کے آخری خط (۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء) میں دو مقام پر البیرونی اور اس کی "کتاب الہند" کا ذکر آیا ہے۔ ایک ہندوستان کے فنونِ لطیفہ سے عربوں کی علوم دلچسپی کے اسباب کے ضمن میں جہاں مولانا نے البیرونی کے عمل سے استدلال کیا ہے کہ اس نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم وعقائد پر نظر ڈالی ہے مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں پھر اس تغافل کا خود ہی جواب بھی دیا ہے کہ غالباً اس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علومِ عقلیہ کے شوق و اشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرتے اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندوستان کے ذوقِ سماع سے اس درجہ مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بمشکل آشنا ہو سکتے تھے، دوسرے جانوروں پر راگ کے اثرات کے ضمن میں البیرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کے طریقوں اور بندروں پر رامائن کے بعض اشعار کی تاثیر کا ذکر کیا ہے۔ مولانا نے البیرونی کی معلومات نقل کر کے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ زمانہ حال کا علم الحیوان نغمہ سرائی کی تاثیر کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا اور تاثرات کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ آخر کے چند جملوں میں مولانا نے اپنے مطالعے کی دنیا کا ایک دریچہ کھول دیا ہے جس سے جھانک کر ہم یہ دیکھ لے سکتے ہیں کہ ان کے جہانِ علم و فضل کا ایک گوشہ یہ بھی ہے۔

ابوسلمان شاہجہان پوری

Marfat.com

ابوریحان البیرونی

مسلمانوں کی علمی تاریخ میں ہمیں تین دھارے ملتے ہیں جن میں سے ایک مختلف نشیب و فراز سے گزرتا ہوا بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں وقت کے ریگ زار میں گم ہو جاتا ہے۔ دو دھارے کچھ دن اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں، لیکن پھر ایک اور معدوم ہو جاتا ہے، بس اس کے بعد ایک رہ جاتا ہے جو اب تک جاری ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے:

عام طور پر مسلمانوں کی تمام علمی و فکری سرگرمیوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا رہا ہے، ایک علوم نقلیہ اور ایک علوم عقلیہ، لیکن ایک اور حصہ علوم عملیہ کا بھی رہا ہے (اگر یہ اصطلاح وضع کی جا سکے)۔ یوں تو علمی و فکری زندگی میں اکثر اس طرح کی تقسیم مکمل طور پر سائنٹفک قرار نہیں دی جا سکتی، لیکن افہام و تفہیم کی روایت کچھ اسی طرح کی رہی ہے۔ علوم نقلیہ وہ ہیں جن میں بنیادی طور پر اس تعلق کی تعریف و تحدید ہوتی ہے جو خدا اور اس کی مخلوق اور مخلوق اور مخلوق کے مابین ہونا چاہیے، علوم عقلیہ میں فلسفیانہ افکار اور تصوّف کے فکری گوشے شامل ہیں اور علوم عملیہ ہم اُن علوم کو کہیں گے جو زندگی کے عملی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور ان میں نظری اور اطلاقی سائنس شامل ہے، جیسے طب، ہئیت، طبیعی علوم، ریاضی، انجینیرنگ، علم النجوم، فارمیسی، زراعت، حیاتیاتی علوم اور فن تعمیر وغیرہ۔ یہ علوم وہ ہیں جو علوم نقلیہ سے کہیں متصادم نہیں ہوتے جبکہ فلسفہ اور تصوف کے بعض فکری مباحث علوم نقلیہ کی بعض اہم تاسیسات سے ٹکرا جاتے ہیں اور ان عقائد کو فکر و نظر کا موضوع بناتے ہیں جن کے بارے میں علوم نقلیہ کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے، یہ عقائد درحقیقت مذاہب کی بنیاد ہیں، یہ بنیاد ہل جائے تو مذہب مذہب نہیں رہتا، فکر و فلسفہ بن جاتا ہے۔

Marfat.com

تاریخ اسلام میں دسویں اور گیارہویں صدی ترقی علوم کے لحاظ سے، خاص طور پر علوم عقلی اور علوم عملی کی ترقی کے اعتبار سے، بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ علوم نقلی کے شعبے میں بھی بعض ایسے علما اٹھے جن کا اثر علوم نقلی کے علاوہ دوسرے علوم پر بھی گہرا پڑا، لیکن اس موقع پر اُن کے علمی کارناموں کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو زمانہ مسلمانوں کی تاریخ میں سیاسی ابتری اور انتشار کا زمانہ ہے، وہی علم و حکمت کا ایک بے مثل دور بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس دور سے پہلے مسلم معاشرہ سیاسی ہنگاموں، فوجی سرگرمیوں، بغاوتوں اور تخالف و تصادم سے پاک تھا، لیکن مجموعی طور پر مرکز میں استحکام تھا۔ عہد اموی ہو یا خلافت عباسیہ کا عہد اولیں، یا اندلس میں عربوں کی حکومت کا عہد زریں، ان صدیوں میں سیاسی و فوجی سرگرمیوں کے باوجود عام فضا علم و حکمت کی ترقی کے لئے سازگار تھی اور مسلمانوں میں قرآنی تعلیمات کے سبب حصول علم کا جو روز افزوں شوق پیدا ہو گیا تھا اس کی معجز نمائیاں اس دور میں خوب خوب ظاہر ہوئیں، یہ جو حالی نے کہا تھا کہ

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

تو اس سے اشارہ بیت الحکمت، بغداد و بصرہ کے علمی مراکز، قرطبہ و غرناطہ کے مدارس اور دارالکتب اور امراء اور علماء کے دیوان اور ذاتی کتب خانوں میں روشن علم و حکمت کی شمع کی طرف تھا جس سے اطراف و اکناف عالم میں علم و تہذیب کی روشنی پھیل رہی تھی۔

تمدن عالم کی تاریخ کا یہ وہ دور ہے جس کی دُور رس اور نتیجہ خیز علمی سرگرمیوں کے عالمگیر اثرات سے مسلمانوں کے بڑے سے بڑے دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ صحرائے عرب سے اسلام جب نکلا تو اُن علاقوں میں پھیلا جو تہذیب و تمدن کے گہوارے رہ چکے تھے، مصر و ایران، عراق و فلسطین وہ علاقے تھے جو کبھی آفتاب تمدن کے آسمان تھے اور نہ معلوم علم و تہذیب اور اقوام و السنہ کے کتنے کارواں اُن شاہراہوں سے گزر چکے تھے جن کے ذریعے ایران کے ثقافتی و علمی مراکز کا دجلہ و فرات کی وادیوں، فونیقیوں اور فلسطینوں کی بستیوں، عریش و فسطاط، اسکندریہ اور وادیٔ نیل کی سرزمین سے رابطہ قائم تھا۔ ایک یونان تھا جو اس وقت مسلمانوں کی کشورستانی سے محفوظ تھا، لیکن مشرقی رومی سلطنت کے عیسائی تعصب نے وہاں کے عالموں کو یونان کے جنوب میں

Marfat.com

شرقی بحیرۂ روم کے ان جزیروں اور ساحلی علاقوں میں پناہ لینے اور بسنے پر مجبور کر دیا تھا جہاں اب مسلمان پھیل گئے تھے، یہ یونانی عالم اپنے سینوں اور سفینوں میں یونان کا بچا کھچا علم و فلسفہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ مسلمانوں نے اپنے سیاسی و تمدنی عروج کے اس عہد میں اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور چونکہ قرآن نے ان پر قلم اور بیان کی دینی و دنیوی اہمیت واشگاف کر دی تھی، اس لئے عالمگیر جہانبانی کے ساتھ علم و عرفان کی کشور کشائی بھی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ اور یہ بات دلچسپ بھی ہے اور باعث حیرت بھی کہ سیاسی نشیب و فراز، مرکزی حکومت کی کمزوری اور عمومی انتشار اور امراء و سلاطین کی علاقائی، خاندانی، نسلی اور کبھی کبھی مذہبی عصبیتوں اور ان کے محارب اور معرکوں کے باوجود مسلمانوں کی علم دوستی اور ہنر پروری کا سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہا۔ علم کا مشوق جیسا اُن میں سکون و استحکام کے دور میں تھا ویسا ہی طوائف الملوکی اور سیاسی انتشار و افتراق کے دور میں بھی قائم رہا۔" دربار کو چھوڑو جہاں رات دن زر و جواہر اہل علم کے قدموں پر نثار ہوتے تھے، بزم کو جانے دو جہاں علمی دلچسپیاں سوسائٹی کا عام مشغلہ تھیں، رزم کو لو جہاں ہر شخص شمشیر بکف ہے اور گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ جو ہاتھ تلوار پکڑے ہوئے ہیں انھوں نے کبھی قلم بھی چھوا ہوگا۔ لیکن اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کرتے چلے جاؤ، جا بجا جہاں جدال و قتال کا نقشہ جما پاؤ گے وہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی صورتیں نظر آئیں گی جو قلم کی بھی ویسی ہی دھنی ہیں جیسی تلوار کی۔

"ہر چند کہ علم کی سرپرستی حکومت اسلامی کا عام شیوہ تھا، لیکن مسلمانوں کی ترقی علم کا مدار محض دولت پر نہ تھا بلکہ زیادہ تر ان پرستاران علم کی ذاتی جد و جہد پر تھا جو بجز فضل و کمال اور علم و دانش کے کسی دوسری چیز کے سامنے اپنی پشت خم کرنا علم و فضل کی توہین تصور کرتے تھے۔ اسی بے نیازی اور استغنا کا نتیجہ تھا کہ حکومت و دولت کی گردن اکثر ان کے در پر جھکی رہتی تھی۔ علم کی عام قدر و منزلت اور وسیع اشاعت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود مسلمان فرمانروا اپنے لئے تحصیل علم کو طرۂ امتیاز تصور کرتے تھے۔ تاریخ بہت سے ایسے مسلمان تاجداروں کے نام گنوا سکتی ہے جنھیں علم و فضل کے دربار میں ممتاز جگہ ملے گی۔[1]

دسویں و گیارہویں صدی جو علمی ترقی کے اعتبار سے تاریخی اہمیت کی صدیاں ہیں،

۱۔ سید حسن برنی، البیرونی، طبع دوم، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۲۷ء صفحات ۱۰-۹

Marfat.com

ایسے فرمانرواؤں اور علما و فضلا، سے بھری پڑی ہے۔ اس کی تفصیل ایک دفتر چاہتی ہے جس کا یہاں موقع نہیں کیا علمی دنیا الخجندی، ابوالوفاء، ابونصر بن علی بن عراق، احمد بن عبداللہ حبش، ابن مسکویہ، فارابی، الرازی، ابن سینا، المجریطی، الزرقانی اور ابن باجہ کے علمی کارناموں سے ناواقف ہے؟ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک درخشاں کڑی ابوریحان البیرونی کی عظیم شخصیت بھی ہے جس کے علمی کارناموں پر صدیوں پردہ پڑا رہا لیکن اس دور میں جب علم و تحقیق کے شیدائیوں کو اُس کی بعض کتابوں کا سراغ ملا اور انھیں ان کے مشمولات کی خبر لگی، تو ان میں سے ہر عالم اور ہر محقق پکار اٹھا کہ وہ آسمان علم کا مہر منیر ہے اور دنیا کی علمی تاریخ میں معدودے چند افراد ہی اس کی ہمسری کے مستحق قرار پا سکتے ہیں

محمد بن احمد ابوریحان کو شروع ہی سے بیرونی (البیرونی) کہا جاتا تھا، یا بعد میں وہ اس لقب سے مشہور ہوا، اس کے بارے میں تذکرہ اور تاریخ کی کتابیں خاموش ہیں، اس کے مولد سے متعلق نئی تحقیقات نے اس نظریے کو مشتبہ کر دیا ہے کہ وہ خوارزم کے مضافات میں ایک قریے میں پیدا ہوا تھا اور چونکہ وہ خاص خوارزم کا نہ تھا اور اہل خوارزم اپنے شہر سے باہر کے رہنے والوں کو بیرونی کہتے تھے اس لئے اس کی نسبت بھی بیرونی ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان میں البیرونی کی یاد میں جو کتاب چھپی ہے اس میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (اسلام آباد) کے پروفیسر شمسی کا بھی ایک مقالہ ہے۔ پروفیسر موصوف لکھا ہے کہ محمد بن تاویت الطنجہ کو البیرونی سے متعلق اپنی تحقیقات کے دوران خود البیرونی ایک بیان اس کی جائے و تاریخ پیدائش کے بارے میں اس کے رسالے مقالۃ فی حکایۃ اہل الہند فی استخراج المعمر میں ملا اور اسے انھوں نے البیرونی کی کتاب تحدید نہایۃ الاماکن تصحیح مسافات المساکن کے اپنے نئے ایڈیشن میں نقل کیا ہے۔ اس بیان سے پتہ چلتا ہے وہ اس وقت کے خوارزم کے دارالسلطنت (مدینۃ خوارزم) میں ۳ ذی الحجہ (پنجشنبہ سنہ ۳۶۲ھ کو پیدا ہوا۔ خوارزم کا دارالسلطنت اس وقت کاث تھا۔ پروفیسر شمسی نے بڑی کاوش سے تمام معلوم شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے کاث ہی کو البیرونی کا مولد ثابت ہے۔ لیکن ان کے لئے بھی یہ مسئلہ سوال ہی بنا رہا کہ اُسے البیرونی یا بیرونی کیوں کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے۔ اب بہرحال ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اُسے بیرونی کے نام سے اس لئے نہیں شہرت ملی کہ وہ بیرون نام کے کسی مقام پر پیدا ہوا یا یہ کہ وہ خاص شہر کاث سے باہر کسی جگہ پیدا ہوا تھا۔ اس بات پر یقین کرنے کے اس

ی ہیں کہ خوارزم کی سرزمین اس کا وطن تھی۔ پھر اُسے البیرونی کیوں کہا گیا؟ میرا خیال ہے کہ دو طرح سے اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خوارزم کے پورے علاقے پر امیر کرُکانج (جرُجانیہ) کے قبضہ سے پہلے بھی اسے البیرونی کہا جاتا تھا، پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا خاندان خارج خوارزم سے تعلق رکھتا تھا... لیکن اگر یہ بعد کا اضافہ ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خارج خوارزم کے رہنے والے بھی اجنبیوں یا باہر سے آکر بسنے والوں کو 'بیرونی' کہتے تھے اور چونکہ اُسے یہ پسند نہیں تھا کہ اسے الخوارزمی کہا جائے اس نے البیرونی' کی نسبت ہی کو اپنے لئے منتخب کیا۔" (صفحات ۲۶۷-۲۶۶)

البیرونی کے خاندان سے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا بچپن کس طرح گذرا اور اس نے تحصیل علم کے لئے کن کن فضلائے روزگار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عجمی تھا اور آثار باقیہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اُسے اپنے عجمی ہونے پر فخر بھی تھا۔ جو علوم اس نے سیکھے اور جس زبان میں اظہار خیال کے لئے اس نے کامل دستگاہ حاصل کی وہ علوم اور وہ زبان اس عرب تمدن کا جزو لاینفک تھے جو عہد بنی عباس کے آغاز ہی میں تمام اسلامی علاقوں کا تمدن قرار پا چکا تھا۔ اس تمدن کا مدار عربی زبان پر تھا اور اس کی علمی زبان عربی تھی اور عربی زبان و ادب میں البیرونی کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اسی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"وہ ایک بڑا ادیب اور لغوی تھا اور (ان علوم) میں اس کی تصانیف بھی ہیں جن کو میں نے دیکھا ہے، ایک تو ابو تمام کے اشعار کی شرح ہے جس کا نسخہ میں نے خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے لیکن وہ ناتمام رہا۔ دوسری کتاب کا نام التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم فی معانی نظم ابی الفضل ہے، ایک کتاب میں اس نے سلطان محمود کے زمانے کی تاریخ اور اس کے باپ کے حالات لکھے ہیں، خوارزم کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام کتاب السامرہ[1] ہے، ایک اور کتاب مختار الاشعار والآثار ہے، اور نجوم، ہیئت، منطق اور حکمت کے موضوعات پر اس نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بے شمار ہیں۔ میں نے وقف جامع مرو میں ان کتابوں کی فہرست گنجان خط میں ساٹھ ورق میں دیکھی ہے۔"[2]

۱۔ اس کتاب کے نام سامیر خوارزم ہے، بیہقی کی تاریخ میں غلطی سے مشاہیر خوارزم چھپ گیا ہے (سید حسن برنی ص ۶۳)

۲۔ یاقوت، معجم الادباء، سترھویں جلد، وزارۃ المعارف العمومیہ، مصر، صفحہ ۸۵

Marfat.com

اسی موقع پر جبکہ البیرونی کی تصانیف کا ذکر آگیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مکتوب کا تذکرہ کر دیا جائے جو اس نے اپنے ایک دوست کو اپنی اور ابوبکر ابن زکریا الرازی کی تصانیف کے بیان میں لکھا تھا۔ یہ مکتوب ایک مستند اور نہایت اہم دستاویز ہے اور اس سے محققین کو البیرونی کی صحیح تاریخ ولادت متعین کرنے میں مدد ملی ہے۔ یہ مکتوب اس نے ۴۲۷ ہجری میں لکھا تھا اور کہا تھا کہ اس وقت میری عمر ۶۵ سال قمری اور ۶۳ سال شمسی ہے۔ اس مکتوب میں البیرونی کی فہرست کتب کے سلسلے میں شہرزوری کا یہ بیان جس کی تائید معجم الادبا، سے بھی ہوتی ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے:

"بیرونی ہمیشہ علوم کے حاصل کرنے میں محو رہتا تھا اور کتابوں کی تصنیف پر جھکا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ سے قلم کو، دیکھنے سے آنکھ کو اور غور و فکر سے دل کو کبھی جدا نہ کرتا تھا، مگر سال میں صرف دو روز یعنی نوروز اور مہرجان کے دن جب وہ اپنے کھانے وغیرہ کا سامان مہیا کرتا تھا۔"[1]

البیرونی کا یہ مکتوب لیڈن میں (مخطوطہ نمبر ۱۳۲) محفوظ ہے اور اسے ۱۹۳۶ء میں پہلی بار پال کراؤس نے پیرس میں چھاپا تھا، لیکن اس سے پہلے یہ مکتوب جو الرسالۃ الفہرست کے نام سے مشہور رہا اور جس کی شرح ابواسحٰق ابراہیم بن محمد بن الغضنفر التبریزی (م ۱۲۹۲ء) نے المشاطہ لرسالۃ الفہرست کے عنوان سے لکھی تھی، ایڈورڈ وائڈمن اور جے۔ روسکا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا چکا تھا۔ اس میں اس نے رازی کی ایک سو چوراسی اور اپنی ایک سو تیرہ کتابوں کے نام لکھے تھے، ایک سو تیرہ میں اس کی وہ کتابیں بھی شامل تھیں جو اس وقت نامکمل تھیں۔ ان کتابوں سے اس کے ہمہ گیر مذاق حکمت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ حقائق کی تلاش و جستجو میں اس کی محویت اور فراوانی شوق کا کیا عالم تھا۔ اس کی بھرپور شہادت وہ ایک واقعہ ہے جس کا تذکرہ اس نے اپنے اس مکتوب میں کیا ہے اور جسے بقول سید حسن برنی اس نے اس طرح لکھا ہے:

"میں نے ابوبکر بن زکریا الرازی کی اس کتاب کا جو علم الٰہی کے متعلق ہے مطالعہ کیا۔ اس میں اس نے مانی کی کتابوں کی طرف رہنمائی کی ہے۔ بالخصوص اس کتاب کی طرف جس کا نام سفر الاسرار ہے۔ مجھے اس کتاب کے نام سے ایسی فریفتگی ہوئی جیسے اور لوگوں کو کیمیا کے متعلق سونے چاندی کی فریفتگی ہوتی ہے۔ میری نوعمری بلکہ حقیقت کی پردہ پوشی نے دل میں اس کتاب کی

---

[1] معجم الادباء، سترہویں جلد، صفحہ ۱۸۱

Marfat.com

طلب کی کمال خواہش پیدا کی کہ کسی شہر یا ملک میں جہاں اپنا شناسا ہو اُسے تلاش کیا جائے۔ میں چالیس برس سے کچھ زیادہ اسی تپش کی بیتابیوں میں رہا یہاں تک کہ جند ہمدان سے ایک شخص آیا جس نے فضل ابن سہلان کے ذریعہ سے کچھ کتابیں پائی تھیں اور اسے معلوم ہوا تھا کہ مجھے ان کا بہت اشتیاق تھا۔ شخص مذکور نے ان کتابوں کو مجھ سے ملاقات حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا۔ اس کے پاس ایک مجموعہ تھا جس میں مانی کی حسب ذیل کتابیں تھیں: فرقماطیہ، سفر الجوابرہ، کنز الاحیاء، نصح الیقین، تاسیس، انجیل اور شابورقان اور مانی کے چند دوسرے رسالے تھے اور میری مطلوبہ کتاب سفر الاسرار بھی ان میں شامل تھی۔ مجھے اس قدر خوشی ہوئی جیسے پیاسے کو شربت کے دیکھنے سے ہوتی ہے، لیکن اخیر میں ایسا ملال ہوا جیسے ناگوار چیز کھانے سے ناگوار ڈکار آتی ہے۔ میں نے خدا کو اپنے قول میں سچا پایا کہ جس کو خدا روشنی نہیں دیتا اس میں روشنی نہیں ہوتی؛ پھر میں نے اس کتاب میں سے لغو اور بیہودہ باتوں کو باختصار ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ جو شخص میری طرح گرفتار مصیبت ہو اسے پڑھ کر جلد شفا حاصل کرلے جیسا کہ میرا حال ہوا۔[1]

البیرونی نے اپنے عہد کے تقریباً تمام متداول علوم میں کامل دسترس بہم پہونچائی تھی۔ مبدفیض سے اُسے غیر معمولی حافظہ اور ایک خلاق ذہن ملا تھا، اس میں دقت نظر کے ساتھ وہ علمی نظر بھی تھی جو تجزیاتی اور استقرائی طرز استدلال کی جان ہوتی ہے۔ اُس کا مطالعہ بھی گہرا اور وسیع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے بہت جلد، جہاں تک کہ ریاضی ہیئت، نجوم اور حکمت کا تعلق ہے، اپنے ہمعصر عالموں میں امتیاز حاصل کرلیا۔ اس کی مشہور کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ[2] جس میں گزشتہ زمانوں کے علمی آثار وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، اس کی کم عمری کے زمانے کی تصنیف ہے۔[2] اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے وہ مختلف علوم میں متعدد کتابیں لکھ چکا تھا جن میں وہ خط و کتابت بھی ہے جو البیرونی اور ابن سینا کے مابین ہوئی تھی اور جسے اُس نے ایک رسالے کی شکل میں مدون کرلیا تھا۔ ابن سینا ارسطو کا مقلد تھا، البیرونی نے شاگرد سے گذر کر طبیعات

۱۔ سید حسن برنی، البیرونی، صفحات ۲۱۵۔ ۲۱۴ ۲۔ الآثار الباقیہ کی تصنیف کا زمانہ ۱۰۰۰۔ ۹۹۹ء ہے۔ اس وقت مصنف کی عمر تقریباً ۲۷ سال تھی۔

Marfat.com

سے متعلق خود ارسطو کے بعض مفروضات پر اعتراضات کئے تھے جن سے اس کے تازہ کار فکر کی بلند پروازی پر روشنی پڑتی ہے۔

البیرونی کی ولادت آلِ عراق کے حکمران احمد بن محمد کے عہد سلطنت میں ہوئی۔ اس کا گھرانا کوئی امیر گھرانا نہ تھا اور حسب نسب کے اعتبار سے بھی سربرآوردہ نہ تھا۔ اسے جو شہرت ملی وہ محض اس کے فضل و کمال کی بنا پر ملی۔ اس سے ہمیں مسلم معاشرہ میں نظریۂ مساوات کی کارفرمائی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ علم و فن کی دنیا بھی کسی مخصوص طبقہ کی میراث نہ تھی۔ ایک معمولی شخص پر بھی علم و فن کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور کوئی بھی خواہ امیر ہو یا غریب، اپنے شوق اور اپنی صلاحیت کے مطابق اس خرمن سے خوشہ چینی کر سکتا تھا۔ البیرونی کی زندگی کے حالات ہمیں تفصیل سے نہیں معلوم اور نہ یہ معلوم ہے کہ آلِ عراق نے اس کی کس کس طرح پذیرائی اور قدردانی کی۔ بس، ایک اُس قصیدے سے جو اُس نے سلطان غزنین کے کاتب ابوالفتح بُستی کی مدح میں لکھا تھا، یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ آلِ عراق کا اور خاص طور پر ابو نصر بن منصور علی بن عراق مولی امیرالمومنین کا بہت زیادہ مرہون منت تھا، اسی قصیدے میں اس نے سلطان محمود کے احسانات کا بھی ذکر کیا ہے، اگرچہ سلطان محمود سے اس کے تعلقات پر کچھ مدلل اور کچھ مشتبہ قیاس آرائیوں کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس قصیدے کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں:[1]

مَضَى أَكْثَرُ الأَيَّامِ فِي ظِلِّ نِعْمَةٍ ۔۔۔ عَلَى رُتَبٍ فِيهَا عَلَوْتُ كَرَاسِيَا
فَآلُ عِرَاقٍ قَدْ غَذَوْنِي بِدَرِّهِمْ ۔۔۔ وَمَنْصُورُ مِنْهُمْ قَدْ تَوَلَّى غِرَاسِيَا
وَشَمْسُ الْمَعَالِي كَانَ يَرْتَادُ خِدْمَتِي ۔۔۔ عَلَى نَفْرَةٍ مِنِّي وَقَدْ كَانَ قَاسِيَا
وَأَوْلَادُ مَأْمُونٍ وَمِنْهُمْ عَلِيُّهُمْ ۔۔۔ تَبَدَّى بِصُنْعٍ صَارَ لِلْحَالِ آسِيَا
وَآخِرُهُمْ مَأْمُونُ رَفَّهَ حَالَتِي ۔۔۔ وَنَوَّهَ بِاسْمِي ثُمَّ رَأَّسَ رَاسِيَا
وَلَمْ يَنْقَبِضْ مَحْمُودُ عَنِّي بِنِعْمَةٍ ۔۔۔ فَأَغْنَى وَأَقْنَى مُغْضِياً عَنْ مَكَاسِيَا
عَفَا عَنْ جَهَالَاتِي وَأَبْدَى تَكَرُّماً ۔۔۔ وَطَرَّى بِجَاهٍ رَوْنَقِي وَلِبَاسِيَا
عَفَاءٌ عَلَى دُنْيَايَ بَعْدَ فِرَاقِهِمْ ۔۔۔ وَوَاحَزَنِي إِنْ لَمْ أَزُرْ قَبْلُ آسِيَا
وَلَمَّا مَضَوْا وَاعْتَضْتُ مِنْهُمْ عِصَابَةً ۔۔۔ دَعَوْا بِالتَّنَاسِي فَاغْتَنَمْتُ التَّنَاسِيَا
وَخَلَّفْتُ فِي غَزْنِينَ لَحْماً كَمُضْغَةٍ ۔۔۔ عَلَى وَضَمٍ لِلطَّيْرِ لِلْعِلْمِ نَاسِيَا
فَأُبْدِلْتُ أَقْوَاماً وَلَيْسُوا كَمِثْلِهِمْ ۔۔۔ مَعَاذَ إِلٰهِي أَنْ يَكُونُوا سَوَاسِيَا

---

[1] معجم الادبا، سترہویں جلد، صفحات ۱۸۸-۱۸۷

بِجُهْدٍ شَأَوْتُ الْجَالِبِينَ أَئِمَّةً — فَمَا اقْتَبَسُوا فِي الْعِلْمِ مِثْلَ اقْتِبَاسِيَا
فَمَا بَرَكُوا لِلْبَحْثِ عِنْدَ مَعَانِمٍ — وَلَا احْتَبَسُوا فِي عُقْدَةٍ كَاحْتِبَاسِيَا
فَسَائِلْ بِمِقْدَارِي هُنُودًا بِمَشْرِقٍ — وَبِالْغَرْبِ مَنْ قَدْ قَاسَ قَدْ دِعَمَاسِيَا
فَلَمْ يَنْتَهِمْ عَنْ شُكْرِ جُهْدِي نَفَاسَةً — بَلِ اعْتَرَفُوا طُرًّا وَعَافُوا انْتِكَاسِيَا

اشعار کا مفہوم یہ ہے:

"اکثر زمانہ نعمت کے سایے میں گذرا اور میرا رتبہ بلند رہا۔ آل عراق نے میری سرپرستی کی خصوصاً منصور نے میری بنیادیں جمائیں۔ شمس المعالی (قابوس بن وشمگیر) میری صحبت کا متمنی رہتا تھا، اگرچہ میں اس کی سخت گیریوں سے متنفر تھا، اور آل مامون میں ایک علی تھا جو میرا غمخوار رہا، اس خاندان کے آخری فرمانروا مامون نے مجھے خوشحال بنا دیا، مجھے شہرت دی اور مجھے سربلند کیا، (سلطان) محمود نے مجھے کسی نعمت کے بخشنے میں کبھی کوئی دریغ روا نہ رکھا، مجھے کافی دیا اور میری سخت طلبی سے چشم پوشی کی۔ میری حماقتوں سے درگذر کیا، میری عزت افزائی کی اور اس کے جاہ و مرتبت سے میرے دن پھر گئے۔ یہ لوگ نہ رہے تو میری دنیا تاریک ہو گئی جس طرح پرندوں کے لئے گوشت کا ایک لوتھڑا چھوڑ دیا جاتا ہے اسی طرح اب میں غزنیں میں علم کو بھلا دینے والوں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہوں۔ میں نے حصول علم میں بڑی جد و جہد کی اور وقت کے اماموں سے آگے بڑھ گیا۔ میری قدر مشرق میں ہندوؤں سے پوچھو اور مغرب میں اُس شخص سے جسے میری علمی کاوشوں کا اندازہ ہے۔ (مجھے یقین ہے) کہ وہ اس کا اعتراف کریں گے،"

خوارزم میں آل عراق کی حکومت ۹۹۵ء تک رہی اور اس کے بعد البیرونی کے چند سال پریشاں حالی میں گذرے۔ تفصیلات کا تو علم نہیں لیکن آثار باقیہ میں رَے میں اس کے کچھ عرصہ تک قیام کا تذکرہ ہے، یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ والیِ جرجان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار میں کیسے پہونچا، لیکن جب وہ وہاں پہونچا تو اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ قابوس کے ادبی فضائل اور علمی کمالات شعراء و ادباء کے تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ لیکن وہ ایک جابر اور سخت دل حکمراں تھا اور جیسا کہ اُس نے مذکورہ بالا قصیدہ میں لکھا ہے، البیرونی کو اس سے کبھی کوئی تعلق خاطر نہیں پیدا ہوا، پھر بھی وہ وہاں کئی سال مقیم رہا۔ اس زمانے میں بھی وہ علم و فن کی خدمت کی طرف سے غافل نہ تھا

Marfat.com

آثار باقیہ اس نے یہیں لکھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ رسایل قلمبند کیے۔

جرجان سے وہ علی بن مامون کی دعوت پر اپنے وطن لوٹا اور پھر سلطان محمود کی فتح خوارزم (۱۰۱۷ء) تک وہ وہیں رہا۔ علی بن مامون کی دوستی اور اس کے وزیر السہیلی الخوارزمی کی ہنر پروری ابن سینا کو بھی بخارا سے خوارزم کھینچ لائی تھی۔ علی کے بعد اُس کا بھائی ابو العباس مامون بادشاہ ہوا جس کے دربار کی علمی آب وتاب قابلِ رشک تھی اور خوارزم شاہیوں کی علم دوستی کی روایت کو زندہ کیے ہوئے تھی۔ لیکن اس عہد میں وسط ایشیا کے سیاسی حالات نہایت ابتر تھے اور سلطان محمود کی بڑھتی ہوئی طاقت سبھی امراء و سلاطین کے سر پر ہمہ وقت تلوار بن کر لٹکتی رہتی تھی، آخرکار وہ وقت آ پہونچا جب خوارزم میں آلِ مامون کا ستارہ گردش میں آیا، محمود نے خوارزم پر لشکر کشی کی اور اُسے فتح کر لیا۔ البیرونی ابو العباس کا معتمد علیہ اور سلطنت خوارزم کا مشیر تھا۔ کیسا حسنِ اتفاق تھا کہ وہ محمود کے جذبۂ انتقام سے محفوظ رہا اور محمود کے ساتھ دیگر اعیان و مشاہیر خوارزم کے ہمراہ غزنین پہونچا، ابن سینا محمود کی فتح سے پہلے ہی خوارزم کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ اس طرح وہ علمی مجلس جو خوارزم کے دربار شاہی کی امتیازی خصوصیت تھی، ہمیشہ کے لئے درہم برہم ہو گئی۔

دربار محمود سے البیرونی کی وابستگی سے متعلق طرح طرح کے واقعات مشہور اور کتابوں میں درج ہیں، ہم یہاں ان کا ذکر نہیں کرتے، البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ خوارزم میں جس قسم کا علمی ماحول تھا، البیرونی کو اُس طرح کا ماحول غزنین میں نہیں ملا۔ علم و حکمت سے جو شغف آلِ عراق اور آلِ مامون کو تھا سلطان محمود پر اس طرح کے علمی شغف کا الزام ہم نہیں لگا سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسا کہ اُس زمانے کا چلن تھا کہ سلاطین و امراء اپنی بارگاہوں کو علماء و ادباء و شعراء سے مزین رکھتے تھے، محمود بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کے دربار میں اہلِ علم اور اربابِ فن کا مجمع رہے اور اس لحاظ سے کوئی اور دربار اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے۔ پھر البیرونی علم نجوم کا ماہر تھا اور حکمرانوں کو اکثر اس فن کے ماہرین کی ضرورت رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ البیرونی نے اسی کو غنیمت جانا ہو اور اس مغتنم صورت حال کو سکون و سلامتی کے ساتھ اپنی علمی تشنگی کے بجھانے کا ذریعہ سمجھا ہو۔ خوارزم میں وہ کاروبار سلطنت میں بھی شریک رہتا تھا، اُس سلطنت کی تباہی اور سیاسی حالات کی بے اعتباری سے غالباً وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہو کہ وہ آئندہ سیاست و حکومت سے دور ہی رہے گا، اس لیے غزنین پہونچنے کے بعد ہم اُسے یکسر علمی تحقیقات میں منہمک پاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں آنے کے بعد جو اس وقت ہندوستان کا دروازہ تھا،

Marfat.com

اس کے دل میں ہندوستان اور اہلِ ہندوستان سے متعلق حقائق کی دریافت کا شدید شوق پیدا ہوا۔ غزنیں میں بھی خود ہندوؤں کی آبادی تھی، ممکن ہے کہ انھیں دیکھ کر اس کے دل میں ہندوؤں سے متعلق مستند معلومات بہم پہونچانے کا ولولہ پیدا ہوا ہو۔ یہ بات بہرحال بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ البیرونی کی سیاحتِ ہند محمود کی تحریک اور دلچسپی سے ہوئی ہو۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں اپنی نقل و حرکت، قیام اور علوم ہند کی تحصیل کے سلسلے میں اس نے جن مشکلات کی طرف اشارے کئے ہیں، ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس راہ میں محض اس کا شوق ہی رہبر تھا اور اس کی متجسس طبیعت ہی اس کی یار و مددگار تھی۔ ہندوؤں کے علوم سیکھنے اور اُن کی کتابیں حاصل کرنے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں، ان کا ذکر کرنے کے بعد اس نے کتاب الہند میں لکھا:

"یہ ہے ظاہری حال۔ اُن کی کتابیں جمع کرنے کی حرص میں، جہاں سے بھی ان کے ملنے کی امید ہو سکتی تھی، اور اس کے لئے بقدر امکان بے دریغ خرچ کرنے میں، میرے زمانے میں دوسرا کوئی میرا مقابل نہیں تھا اور ایسے لوگ بھی مل گئے تھے جو گمنام اور مخفی مقامات سے ان کا پتہ لگائیں، پھر بھی اندرونی موانع نے ہم کو اس میں عاجز رکھا، اور میرے سوا دوسرے کو بھی اس قسم کے موانع پیش آئیں گے مگر یہ کہ اللہ اپنی مدد سے کسی کو ان حرکات پر قدرت دے جن سے میں محروم تھا (یعنی ایسا موقع مہیا کر دے کہ وہ بے روک ٹوک جہاں چاہے آجا سکے) اور امر و نہی کے کرنے نہ کرنے میں بے بس تھا اور ان کی راہیں مجھ پر بند تھیں، اور جتنا بھی ہو گیا اس پر اللہ کا شکر ہے۔"[1]

البیرونی اور محمود کے مزاج میں بڑا تفاوت تھا، پھر خواجہ احمد بن حسن میمندی بھی جو محمود کا وزیر تھا، غالباً البیرونی سے خوش نہ تھا، بہرحال وجہ کچھ بھی رہی ہو، محمود کے زمانے میں دربارِ غزنیں میں اُسے وہ سازگار فضا میسر نہ تھی جس کا لطف وہ مامونیوں اور قابوس کے دربار میں اٹھا چکا تھا، پھر بھی یہ اس کا کمال اور اس کے علمی شوق کی انتہا ہے کہ کوئی بارہ تیرہ برس اُس نے اہل ہند کے علوم کے سیکھنے اور اُن کی تہذیب و ثقافت کے سمجھنے میں صرف کئے۔ اس عرصہ میں وہ کئی بار ہندوستان آیا اور غزنیں واپس گیا، کئی کتابیں اور مقالے لکھے، سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی اور سنسکرت کی بعض کتابوں کے عربی ترجمے کئے اور یہ سب کام اُس نے ایسے حالات میں کئے کہ وہ اپنے

---

[1] کتاب الہند، جلد اول (اردو ترجمہ)، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۱

احوال سے مطمئن نہ تھا، اُدھر مغربی ہندوستان میں محمود کے حملوں سے ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی، اہل ہند کے دلوں میں حملہ آوروں اور اُن کے ہم مذہبوں کے خلاف معاندانہ جذبات متلاطم تھے۔ ایک طرف فوج کشیاں ہیں، تلواریں سونتی جارہی ہیں، نیزے تیز کئے جا رہے ہیں اور ترکشوں میں تیر بھرے جا رہے ہیں، دوسری طرف یہ ہے کہ ایک مسلمان عالم خاموشی کے ساتھ اس دُھن میں ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ علمی رابطہ قائم کیا جائے، علمی دیانتداری کے ساتھ ان کے علوم کو سیکھا اور ان کی تہذیب کو سمجھا جائے اور اپنے ہم مذہبوں اور تمدن و ثقافت کے طالب علموں اور عالموں کے لئے ایسی یادگار چھوڑ جائے جو دو ایسی قوموں کے مابین افہام و تفہیم کا وسیلہ بنے جن کا عقائد و اعمال میں بعض بنیادی اختلافات کے باوجود، ساتھ ساتھ رہنا مقدر بن چکا تھا۔ صد آفریں ہے ابو ریحان البیرونی کو جس نے ایسے پُر آشوب زمانے میں وہ کارنمایاں انجام دیا جسکی نظیر دنیا کی علمی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

۱۰۳۰ء میں سلطان محمود کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد محمود کے بیٹوں محمد اور مسعود میں خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے ختم ہونے میں کوئی ایک سال کا عرصہ لگا۔ سیاسی انتشار کے اس دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی عزلت نشیں ہوکر کتاب الہند کی تصنیف میں مصروف رہا۔ مسعود کو اپنے بھائی پر فتح تو حاصل ہوگئی تھی لیکن وہ اس سلطنت کو باقی رکھنے میں جسے قائم کرنے میں محمود نے اپنی عمر عزیز اور ساری صلاحیتیں صرف کردی تھیں، کامیاب نہ ہوسکا اور آخر میں اس کے پاس بجز ہندوستان کے اور کچھ نہ بچا۔ سیاسی اور فوجی اعتبار سے مسعود ایک ناکام حکمراں تھا، لیکن علمی لحاظ سے اُس کا مرتبہ بلند تھا۔ وہ علم نجوم کا شائق اور حقائقِ علمیہ کا دلدادہ تھا، ادیب تھا اور زبان عربی سے خوب واقف تھا۔ اسی کی خواہش پر البیرونی نے لوازم الحرکتین نامی کتاب لکھی اور القانون المسعودی تو ایسی کتاب ہے جو تنجیم و حساب میں اپنی نظیر آپ ہے[1] مسعود کے بعد محمد کو بادشاہ بنایا گیا لیکن جلد ہی مسعود کے بیٹے مودود نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا اور غزنیں کے تخت پر متمکن ہوا۔ مودود آخری بادشاہ تھا جس سے البیرونی کا سابقہ پڑا۔ اس نے مودود کے لئے جواہرات پر اپنا مشہور رسالہ الجماہر فی معرفت الجواہر قلمبند کیا اور اور بہترین محاسن کے موضوع پر الدستور لکھی اور اس کے نام سے معنون کی[2]

اوپر گذر چکا ہے کہ جب البیرونی نے ایک دوست کی فرمائش پر زکریا الرازی کی

۱۔ معجم الادباء، سترہویں جلد، صفحات ۱۸۵-۱۸۴ ۲۔ معجم الادباء، صفحہ ۱۸۵۔

Marfat.com

کتابوں کی فہرست تیار کی تھی تو اس وقت اس کی عمر ۶۳ برس کی تھی، اپنے دوست کو اُس نے جو خط لکھا تھا وہ ۱۰۳۸ء میں لکھا تھا، اس سے پہلے غالباً ۱۰۳۵ء میں اس کی گرتی ہوئی صحت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ سخت بیمار پڑا تھا[1] اس مکتوب میں اس نے اپنی اس علالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جب میری عمر (ساٹھ) سے کچھ کم ہی تھی تو مہلک بیماریوں نے چاروں طرف سے آدبایا۔ بعض ایک ہی وقت میں پیدا ہوئیں اور بعض یکے بعد دیگرے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ انھوں نے ہڈیوں کو پارہ پارہ، بدن کو چور چور، حرکت تک سے معذور اور حواس باختہ کر دیا۔ باوجود اس کے کہ بڑھاپے سے قویٰ ماؤف ہو چکے تھے، میں نے طبیعت کو درست کرنے کی کوشش کی"۔[2]

غالباً اسی بیماری میں یا صحتیابی کے فوراً بعد البیرونی نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر اُس نے یہ کی تھی کہ ابھی وہ کئی برس زندہ رہے گا لیکن اس سلسلے میں اس نے جو کچھ مذکورہ بالا مکتوب میں لکھا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود البیرونی کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ اب زندگی کی شام آگئی ہے اور آفتاب زیست جلد ہی غروب ہو جائے گا۔ اُسے اپنی زندگی کے رائگاں جانے کا افسوس نہ تھا کہ اس نے ایک مشغول علمی زندگی گذاری تھی، اُسے شاید اس کا بھی غم نہ تھا کہ ساری عمر تجرد میں گذری اور اس کے کوئی اولاد نہ تھی کہ عصائے پیری بنتی کیونکہ اس نے اپنی کتابوں کو جنھیں اس نے آغاز عمر میں تصنیف کیا تھا کبھی کمتر نہ جانا اس لئے کہ "وہ سب میرے فرزند تھے اور اکثر لوگ اپنے کلام اور فرزند پر فریفتہ ہوتے ہیں"۔ (مکتوب محولۂ بالا) البیرونی نے اپنے خواب کی تعبیر کے ذکر کے بعد لکھا تھا۔

"... باوجود اس کے مجھے کچھ خوشی نہ ہوئی، اس لئے کہ عمر بسر ہو چکی تھی اور اس میں صرف ایک کام کرنے کے لئے تھوڑا سا حصہ رہ گیا تھا۔ وہ کام ان کتابوں کا مکمل کرنا ہے جو ناقص حالت میں موجود ہیں اور ان مسودوں کو صاف کرنا جو ابھی تک ناصاف پڑے ہیں، مثلاً، قانون مسعودی وغیرہ اور ان کتب ہند کو حوالۂ قلم کرنا جن کا ترجمہ کرنا پیش نظر ہے۔ اس کے لئے خدا کی مدد، فکر کو منتشر کرنے والی چیزوں سے امن، درازی عمر، تاخر اجل، سلامتی حواس اور عمر کے موافق صحت بدن کے سوا کوئی چیز مقصود نہیں ہے"۔

البیرونی کے ان جملوں سے، باوجود پیرانہ سالی کے، صاف نمایاں ہے کہ اسکی

۱۔ شمسی، صفحہ ۱۷۲۔ ۲۔ سید حسن برنی، البیرونی، صفحہ ۱۰۲ ۳۔ سید حسن برنی، البیرونی، صفحہ ۱۰۳۔

Marfat.com

ہمت مردانہ اور انہماک علمی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بس وہ اتنی مہلت چاہتا ہے کہ اس کے ادھورے کام پورے ہو جائیں اور جب آخری وقت آجائے تو اسے اطمینان رہے کہ اُس نے اپنی تمام اولاد (تصانیف) کو نوک پلک سے آراستہ کر دیا ہے۔ آخر وقت موعود آپہونچا اور ہمارے اس شیفتۂ علم و فن اور فرد فرید نے ۴۴۳ھ (قریب ۱۰۵۱ء)[1] میں پیام اجل کو لبیک کہا اور اس طرح اس کی عمر بھر کی بیقراری کو قرار آگیا۔

یاقوت نے وقف جامع مرو میں البیرونی کی کتابوں کی فہرست گنجان خط میں ساٹھ ورق میں دیکھی تھی، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تصنیفات کا دفتر بے پایاں تھا، لیکن اس میں سے نہ معلوم کتنی کتابیں ناپید ہو گئیں جن کے نام سے بھی ہم ناواقف ہیں۔ اپنے دوست کو اس نے جو مکتوب لکھا تھا اس میں اپنی ایک سو تیرہ کتابوں کی فہرست دی تھی اس کے بعد قمری حساب سے وہ تقریباً ۱۶ برس زندہ رہا اور اس مدت میں یقیناً اس نے کچھ اور کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کے نام اب ہمیں معلوم بھی ہو گئے ہیں۔ اس کی تمام تصنیفات اگر دستیاب ہوتیں تو پتہ لگ سکتا تھا کہ اس نے کتنے علوم کو اپنی فکر و نظر اور اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ان علوم کی ترقی و اضافہ میں اس کا کیا حصہ تھا۔ میں تو اس کا اہل نہیں کہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکوں، لیکن آئندہ ممکن ہے کہ کوئی محقق اور عالم اس سلسلے میں کچھ کہہ سکے۔

البیرونی کی جو کتابیں میری نظر سے گذری ہیں یا اس کی بعض کتابوں کے جو ترجمے میں نے دیکھے ہیں، ان کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے اُسے علوم قطعیہ میں تحقیق و تدقیق ہی کے لئے پیدا کیا تھا۔ ریاضی اور ریاضیاتی علوم کے میدان میں اس کی فکری و تجربی کاوشیں بے پناہ ہیں۔ ہیئت، علم پیمائش ارض (جیوڈیسی)، علم معدنیات، نباتیات، علم الانسان، غرض کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس سے اُسے دلچسپی نہ رہی ہو اور جس سے متعلق اس نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ اس کی فلسفیانہ بصیرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بصیرت کو جلا ملی تھی مذہب سے، اور اسی کے سہارے اُس نے چند اہم مسائل پر غور و فکر کیا تھا۔ ریاضیاتی علوم کا وجدانی اور استخراجی طرز تحقیق اور طبعی اور نیچرل سائنس کا تجربی اور استقرائی طرز استدلال ہمیں البیرونی کی تحقیقات اور

---

[1] البیرونی نے کتاب الصیدنۃ ۴۴۲ھ میں مکمل کی، اس لئے جیسا کہ القفطی تبریزی نے لکھا ہے، البیرونی کا سن وفات ۴۴۰ھ نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

نگارشات میں موضوع کے اعتبار سے جہاں جس کی ضرورت ہوئی، برابر ملتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال میں جدید اصول تحقیق کو برتنے والے عالم البیرونی کو اپنے آپ سے بہت قریب پاتے ہیں۔

ایک اور اہم بات جس کی طرف لوگوں کی نظر کم جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ البیرونی کا نقطۂ نظر اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمین متحرک ہے یا سورج، عالمانہ اور حکیمانہ تھا۔ ایک متبحر عالم علمی معاملوں میں اپنی رائے میں محتاط ہوتا ہے، جو بات ثابت نہیں ہوسکتی وہ نہ تو اس کا اقرار کرتا ہے اور نہ انکار۔ یہی رویہ البیرونی کا اس مسئلہ سے متعلق تھا کہ زمین متحرک ہے یا سورج۔ کتاب الہند میں بھی اُس نے اس کا ذکر کیا ہے[1] اور استیعاب[2] میں بھی جہاں اس نے اصطرلاب زورقی کے متعلق لکھا ہے۔ استیعاب میں وہ لکھتا ہے:

"ابوسعید سنجری نے ایک بڑا اصطرلاب بنایا تھا جس کا عمل مجھ کو بہت پسند آیا اور میں نے ابوسعید کی بہت تعریف کی، کیونکہ جن اصولوں پر اس نے اس کو قرار دیا تھا وہ کرۂ ارض کو متحرک تسلیم کرتے ہیں۔ میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ عقدہ ایسی شبہ کی حالت میں ہے کہ اس کا حل کرنا نہایت دشوار اور اس کا رد کرنا نہایت مشکل ہے۔ مہندسین اور علمائے ہیئت اس عقدہ کے رد میں بہت پریشان ہوں گے..."[3]

اگر اہل یوروپ حرکت زمینی سے متعلق البیرونی کے خیالات سے واقف ہوتے تو شاید وہ بطلیموس کے موقف کو حرف آخر نہ تصور کرتے اور کوپرنیکس سے بہت پہلے یہ ثابت ہوجاتا کہ آسمان نہیں بلکہ زمین متحرک ہے۔ ایک فلسفی کے طرز فکر پر غور و فکر کرکے اُس نے اس مسئلہ سے متعلق شک کا دروازہ کھول دیا تھا اور اُس عقیدہ کی بنیاد کھوکھلی کردی تھی جس پر صدیوں سے ماہرین علم ہیئت کا ایمان تھا۔

البیرونی نہ تو مسلم فلاسفہ کے طرز کا فلسفی تھا اور نہ متکلمین کے طرز کا، پھر بھی ہم اُسے فلسفی کہہ سکتے ہیں کیونکہ کائنات کے وجود اور مابعد الطبیعی امور پر اُس نے فلسفیانہ

۱۔ کتاب الہند، جلد اول، صفحات ۲۷۳-۱۷۳

۲۔ کتاب کا پورا نام کتاب فی استیعاب الوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاصطرلاب ہے۔

۳۔ سید حسن برنی، البیرونی، صفحات ۲۱۱-۲۱۰؛ بحوالہ حالات ابوریحان بیرونی از مولوی عنایت اللہ بی، اے (علیگ)

Marfat.com

بحثیں کی ہیں، ابن سینا سے اس کا جو سوال و جواب ہوا تھا اس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ وہ مشائی فلسفے کی روایت کا قائل نہ تھا، عالم کو قدیم نہیں مانتا تھا اور جزو لایتجزیٰ کے نظریے کے ماننے والوں پر ارسطو کا جو اعتراض تھا اُسے غلط تصور کرتا تھا۔ ارسطو پر اُس کا یہ اعتراض بھی تھا کہ آخر وہ کس دلیل سے اُس عالم کے وجود سے انکار کرتا ہے جو اس عالم سے جدا ہے جبکہ اُس عالم کے امکان کی بہت سی دلیلیں ہیں اور اس کے خلاف جو دلیلیں ہیں انھیں رد کیا جا سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود کی دلیلیں اس کے عدم کی دلیلوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ اور ہیئت پر البیرونی کی جو تصنیفات ہیں ان میں بھی سائنسی اور تاریخی مباحث کے ساتھ فلسفہ، علم کائنات اور مابعد الطبیعات پر اس کے خیالات مل جاتے ہیں۔ کتاب الہند میں جہاں اس نے ہندوؤں کے عقائد و افکار بیان کئے ہیں، وہیں اکثر ہمیں ان عقائد و افکار پر تبصرہ کے ساتھ اُس کے اپنے مابعد الطبیعی اور فلسفیانہ تصورات اور تشریحات بھی ملتی ہیں۔ آثار باقیہ میں زمانہ تاریخ انسانی کے ادوار اور قوانین قدرت میں یک رنگی اور استحکام سے متعلق اس کی جو بحثیں ہیں ان سے اس کی ژرف نگاہی اور علمی تعمق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ "جہاں وہ قوانین قدرت کی مضبوطی کا پورے طور پر معتقد ہے وہاں عالم فطرت کی رنگا رنگ کیفیتوں اور پیچیدہ و لاینحل حالتوں کا خیال بھی اس کے دماغ میں موجود رہتا ہے اور وہ بخوبی جانتا ہے کہ موجودات میں بسا اوقات ایسی طبیعی کیفیتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں جو بادی النظر میں ممکنات سے خارج معلوم ہوتی ہیں اور جن کے اسباب و علل کے معلوم کرنے سے اکثر انسانی عقل عاجز رہ جاتی ہے"۔ اسی ایک بات سے کہ البیرونی نے سنسکرت کی دو کتابیں، سانک اور پاتنجلی کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، مابعد الطبیعی اور روحی مسائل سے اسکی گہری دلچسپی ظاہر و باہر ہے۔ سانک کا موضوع محسوس اور معقول موجودات ہیں اور پاتنجلی میں جسم کی قید سے روح کے نجات پانے کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔

البیرونی مسلمان تھا اور اُس کی بعض تصنیفات میں قرآنی آیات بطور شاہد حق اور دلیل قطعی کے مباحث متعلقہ کے ساتھ اس طرح پر دی گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات انھیں موقعوں کے لئے نازل کی گئی تھیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا کہ اس کا قرآن اور دیگر علوم نقلی کا مطالعہ گہرا تھا اور قرآن فہمی میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھا۔ خدا، رسولؐ اور آخرت پر اس کا ایمان محکم تھا۔ قانون مسعودی کے دیباچے کے بعض برجستہ فقرے صاف پتہ دیتے ہیں کہ وہ محض عبارت آرائی کے لئے نہیں

Marfat.com

ہیں بلکہ ایک سچے مسلمان کے قلب کی گہرائیوں سے نکلی درد و سوز میں ڈوبی آواز ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"نیک بخت ہے وہ جو خدا کی توفیق سے نیک ہوا اور اس کے کرم سے اپنے ہم جلیسوں، وہم عصروں میں یکتا ہوگیا۔ جسے خدا نے اونچا کیا اُسے کوئی پست کرنے والا نہیں ہے۔ آباد زمین کے مغرب و مشرق میں اسلام کیسے پہونچتا اور اس کی خبر دنیا کے دور دراز علاقوں میں کیونکر پہونچتی اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مومنین کے غلبہ کو ظاہر نہ فرماتا۔ اس کے بعد کہ آنحضرتؐ کو جو یتیم تھے پناہ دی اور جو محتاج تھے غنی بنایا، یہاں تک کہ آپ کا سینہ کھول دیا اور آپ کا ذکر بلند کیا، آپ کے ذریعہ اپنے دین کو ظاہر کیا اور اپنے کلمے اور حکم کو بلند کیا۔ پھر رسولؐ کے بعد خدا نے اس نور کا دوسروں کو خلیفہ بنایا جو پھونکوں سے نہیں بجھ سکتا اور نہ زبانوں اور لبوں کے جھٹلانے سے باطل ہو سکتا ہے۔"[1]

کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ البیرونی جیسا فاضل اجل اور عالم متبحر جسکی پوری زندگی اعلیٰ قسم کی سائنسی تحقیق و تدقیق اور علمی موشگافیوں میں گذری، ایک لمحہ کے لئے بھی تشکیک میں مبتلا نہیں ہوا اور اپنے عقیدہ کے اظہار میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ کتاب الہند میں ہندوؤں کے رسم خط اور بعض رسوم کا ذکر جس باب میں ہے اس کے پہلے ہی پیراگراف میں وہ اعلان کرتا ہے کہ "پاک ہے وہ جو حکمت کے ساتھ پیدا کرتا اور مخلوق کے امور کو بہتر بناتا رہتا ہے۔"[2]

یہ صحیح ہے کہ وہ ابوبکر الرازی کی تحریروں سے حوالے دیتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ بھی ہے، لیکن الرازی کے برخلاف اس کے نظریۂ کائنات کا، جیسا کہ اس کے ارضیات اور تہذیبوں کے تقابلی مطالعے سے ظاہر ہے، خدائے خالق و قیوم و قدیم کی کبھی نہ ختم ہونے والی حمد و ثنا سے ایک گہرا رشتہ ہے۔ یہی نہیں کہ البیرونی کے عقیدہ اور سائنس کے مابین کوئی بُعد نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی علمی تحقیقات کا سرچشمہ ایمان باللہ ہی سے پھوٹتا ہے اور تحقیق میں اس کی جودت طبع کی جڑیں اس کے مذہبی عقائد ہی میں پیوست ہیں۔ تحدید میں حدث عالم سے متعلق اس کی بحث کو دیکھیے[3] صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی

۱۔ دیکھیے دیباچہ القانون المسعودی، دائرۃ المعارف حیدرآباد، صفحہ ۱

۲۔ کتاب الہند، جلد اول، صفحہ ۲۲۳

۳۔ ذکی ولیدی توغان، تحفۃ المعمورہ علی البیرونی، دہلی، ۱۹۳۷، صفحہ ۵۴

Marfat.com

تحقیقات کے دوران خدا کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کرتا۔

البیرونی ان مدعیان علم و حکمت میں سے نہ تھا جنھیں مذہب کو عقل انسانی کا رکھنے پر اصرار تھا۔ وہ عقل انسانی کی حدود سے خوب واقف تھا۔ تاریخ اسلام میں عقل و مذہب کا معرکہ شروع ہوا تھا تو مسائل الٰہی کے سلسلے میں کیسی کیسی موشگافیاں ہوئی تھیں اور یہ سب اُس کی نظر میں تھیں لیکن وہ خود اپنی خداداد ذہانت سے کام لے کر اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ مذہب الٰہی عقل کا مخالف نہیں ہو سکتا، البتہ وہ اس کا قائل نہ تھا کہ عقل انسانی ہمیشہ صراط مستقیم پر رہتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عقل انسانی کو امور الٰہی کے تابع رہنا چاہیے اور اگر کبھی ایسی نشانیاں نظر آئیں جو ہماری فہم و ادراک کے مطابق نہ ہوں تو ان نشانیوں کا انکار نہ کرنا چاہیے۔ اسی لئے وہ الرازی جیسے فلاسفہ کی انتہا پسندانہ روشن خیالی اور بے روک تعقل پسندی کا مخالف ہے۔ اسی طرح وہ ان لوگوں کا بھی مخالف ہے جو محض جہالت، تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر کوئی نہ کوئی مذہبی پہلو نکال کر سائنس اور فلسفہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

البیرونی مورخ بھی تھا۔ وہ ایک ایسا مورخ تھا جو تہذیبوں اور ان کا تاسیسات کا مطالعہ کرتا تھا اور اس سلسلے میں اس کا منہاج تحقیق زمانہ حال کے اصول تحقیق سے کسی طرح کمتر نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اپنے زمانے کی فن تاریخ نگاری کا مقلد نہ تھا، وہ مجتہد تھا۔ اختراعی و تخلیقی صلاحیت کے وافر ذخیرے کے ساتھ اس کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع اور گہرا تھا، ایک ایسے عہد میں جب کتابیں بڑی تعداد میں چھپتی نہ تھیں، علمی جرائد کا وجود نہ تھا اور جو معلومات دستیاب تھیں انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں بڑی دشواریاں تھیں، ہمیں جب البیرونی جیسا متبحر عالم ملتا ہے جو مختلف علوم میں مجتہدانہ نظر اور منہاجات تحقیق میں منفرد فکر کا حامل تھا، تو ہم سوچنے لگتے ہیں کہ شاید عظیم شخصیت کا نظریہ صحیح ہو، یعنی یہ کہ ہر عہد میں ایک ایسی استثنائی شخصیت ضرور ہوتی ہے جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور مضبوط قوت ارادی سے حالات کا رُخ موڑ دیتی ہے اور اپنے عہد پر اپنی شخصیت کا دوامی نقش چھوڑ جاتی ہے۔ علمی دنیا میں بھی ایسی شخصیتوں کی مثالیں ملتی ہیں اور اس لحاظ سے البیرونی بلاشبہ نابغۂ روزگار تھا۔

وہی مورخ اچھا مانا جاتا ہے جس کا جغرافیہ کا علم بھی اچھا ہو۔ البیرونی اس راز سے واقف تھا اور اس کی جغرافیائی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ وہ واقعات و حقائق سے کسی صورت میں بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کرتا اور ان کے بیان میں بڑی وضاحت اور کامل احتیاط سے کام لیتا ہے لیکن وہ اسے بھی خوب سمجھتا ہے کہ تاریخ اور سائنس

Marfat.com

دونوں کا منصب یہ ہے کہ وہ وقائع وحقائق سے آگے بھی دیکھیں۔ کیونکہ صرف واقعات کی کھتونی سے کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ان کی تعبیر وتشریح ضروری ہے۔ البیرونی کا خیال تھا کہ تاریخ واقعات کے تسلسل کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور اصل تاریخ تصورات وادارات ہی کی تاریخ ہوتی ہے۔ کتاب الہند کے مطالعے سے البیرونی کے تصور تاریخ سے متعلق یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔ اس کی اس تصنیف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں اہل ہند کے عقائد، مذہبی رسوم وآداب اور تہذیبی خصائص کو اس وقت تک گہرائی اور سچائی سے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک کہ ان کے فلسفے اور نظریۂ حیات کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ البیرونی سے پہلے جو مسلم جغرافیہ داں اور اقوام وملل کے موضوع پر لکھنے والے گذر چکے تھے ان کے یہاں ہمیں وہ ہمہ گیری، گہرائی، مقصدیت اور باضابطگی نہیں ملتی جو اس خوارزمی عالم کے یہاں ملتی ہے۔ کتاب الہند سے صرف یہی نہیں پتہ چلتا کہ اس کے مصنف کو اہل ہند کے احوال وعقائد کے جاننے کا شوق تھا، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ شوق برائے شوق اور اُس کا یہ تجسس برائے تجسس نہ تھا۔ وہ درحقیقت یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی تہذیب سے جو اس کی اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی تہذیب سے بالکل مختلف اور متغائر تھی، ایسا رشتہ قائم ہو جائے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں آسانی ہو، اس کتاب کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے کہ

> "استاد موصوفؒ ..... کی یہ خواہش ہوئی کہ جو کچھ ہم کو ہندوؤں کے بارے میں معلوم ہوا ہے وہ قلمبند کر دیا جائے تاکہ ان لوگوں کو جو ان سے بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیال کرنا چاہیں اس سے مدد ملے اور جو لوگ ان سے میل جول پیدا کرنا چاہیں ان کے لئے بھی کارآمد ہو..... ہم نے اس کو اس طرح لکھ ڈالا کہ اس میں کسی فریق کی ٹرٹ کوئی ایسا قول منسوب نہیں کیا ہے جو اس کا نہیں ہے اور نہ اس کا کلام نقل کرنے سے اگر وہ حق کے مخالف اور اہل حق کو اس کا سننا گراں ہو، احتراز کیا ہے۔ وہ اس فریق کا اعتقاد ہے اور وہ اپنے اعتقاد سے بخوبی واقف ہے۔"[2]

البیرونی نے تحصیل علم اور تحقیق فن کی ہر منزل میں مشاہدے اور تجربے کی ضرورت پر اصرار کیا اور ایک سچے سائنس داں کی مانند ان لوگوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا جو بغیر

۱۔ یعنی ابوسہل عبدالمنعم ابن علی ابن نوح نفلسی (کتاب الہند، اردو ترجمہ، صفحہ ۷)

۲۔ کتاب الہند (اردو ترجمہ) جلد اول، صفحہ ۸

Marfat.com

تنقید اور جانچ کے روایت کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ تفریق پرستی کا مخالف تھا اور کہا کرتا تھا کہ اپنی عالمگیر سچائیوں کی سطح پر تمام مذاہب ایک ہیں، اگر ناحق کی طرفداری اور تائید میں غلو کیا جائے تو حمیت کے مناسب طریقے سے بہک جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن جس شخص کا مقصد اللہ اور اللہ کے واسطے حق ہوتا ہے، اللہ اس کو ثابت قدم رکھتا ہے[1]

ابوریحان البیرونی ایک ایسا معقول سائنس داں تھا جو اس حماقت میں کبھی مبتلا نہیں ہوا کہ تجربی سائنس کے اصولِ تحقیق سے مذہب اور علوم انسانی کے شعبہ میں کام لے۔ اس سلسلے میں اس کا نظریۂ علم بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کا نظریۂ علم یہ تھا کہ علم کی مختلف شکلیں بتدریج ارتقاء کے مراحل سے گذرتی رہتی ہیں لیکن وہ بنیادی علم جس کا سرچشمہ وحی الہٰی ہے، تغیرپذیری سے مبرا ہے۔ علوم پر جب بھی اُس نے لکھا اس کا خیال رکھا کہ پہلے ان کے ارتقاء کی تاریخ بیان کر دے۔ تاریخ مذاہب اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کا بانی تو وہ ہے ہی، غور سے دیکھئے تو ایک لحاظ سے اس نے تاریخ سائنس کی بھی بنیاد رکھی۔ لیکن اُس نے کبھی اور کسی حالت میں بھی غیر تغیرپذیر علم کو فروگذاشت نہیں کیا جس کی کوکھ سے تمام انسانی علوم جنم لیتے اور ردو اضافہ کے مراحل سے گذر کر ارتقاء کی راہوں کو طے کرتے رہتے ہیں۔

سائنسی علوم کی دنیا میں البیرونی نے جو کارنمایاں انجام دیا، عام طور پر لوگوں کی توجہ اسی طرف رہی ہے اور یہ بات نظروں سے اوجھل رہی کہ اپنے عہد میں اور غالباً پوری تاریخ اسلام میں، وہ واحد فرد ہے جس نے مذاہب کے تقابلی مطالعے کی ڈسپلن کو ایک نیا رُخ دیا اور اس شعبۂ علم میں اپنے پیش روؤں سے بہت آگے نکل گیا۔ قبل اس کے کہ اس سلسلے میں البیرونی کی امتیازی خصوصیت بیان کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جرمن مستشرق ایڈورڈ سخاؤ کا شکریہ جذبۂ احسان مندی کے ساتھ ادا کیا جائے جس نے اس کی دو معرکتہ الآرا تصانیف آثار الباقیہ اور کتاب الہند کو ایڈٹ کر کے شائع کیا اور ساتھ ہی انگریزی اور جرمن ترجمے بھی طبع کرائے۔ ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے کتاب الہند کا جو اُردو ترجمہ شائع کیا اس میں بھی سخاؤ کے انگریزی ترجمے سے مدد لی گئی، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے آثار باقیہ کا ترجمہ اردو میں ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ آثار باقیہ کے دیباچے میں البیرونی نے اپنے طریقِ تحقیق کا ذکر کیا ہے جو نکہ ثقافتوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعے میں یہ طریقِ تحقیق بنیادی حیثیت رکھتا ہے

---

[1] کتاب الہند، اُردو ترجمہ: جلد اول، صفحہ ۳۵۴

Marfat.com

ور اسی بنا پر ہم اُسے اِس ڈسپلن کا بانی کہتے ہیں، ضروری ہے کہ اس کا ذکر کر دیا جائے
س میدان میں اپنے اکثر پیش روؤں کے بارے میں اس کی رائے اچھی نہ تھی، لیکن اس کا
خیال تھا کہ اگر تحقیق کا صحیح طریقہ اپنایا جائے تو دوسرے مذاہب کے عقائد و احکام
غیر جانبداری کے ساتھ بیان کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اپنی دونوں مذکورہ
بالا کتابوں میں اُس نے اپنے طریقِ تحقیق پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"... ادباء میں سے ایک صاحب نے مختلف قوموں کی تواریخ (سنین)
کی کیفیت اور ان کے اصول میں اختلاف کی وجہ مجھ سے دریافت کی۔
یعنی تاریخیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور ان کے حصے یعنی سال اور
مہینے جن پر وہ مبنی ہیں، کیا ہیں، علاوہ بریں وہ کیا اسباب تھے جن کی
وجہ سے یہ اختلاف پیش آیا۔ نیز کون کون سے مشہور تیوہار اور میلے، یادگار
ایام، مخصوص اوقات اور رسوم وغیرہ ہیں جو مختلف قوموں میں رائج ہیں۔
صاحب مذکور نے اصرار کیا کہ ان امور کی تشریح ایسی وضاحت کے ساتھ
کر دو کہ یہ باتیں پڑھنے والے کے بخوبی ذہن نشیں ہو جائیں اور اُسے
متفرق کتابوں اور گذشتہ مصنفین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ
رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ایک نہایت دشوار اور مشکل الحصول کام ہے، بالخصوص
اس شخص کے لئے جو ان باتوں کو اس پیرایہ میں لکھنا چاہے کہ پڑھنے والے
کے دل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے ...

"ان مسائل کی بہترین تشریح کے لئے گذشتہ قوموں کے اخبار و
روایات جاننے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ان میں سے اکثر ان کی باقی ماندہ
دینی و دنیوی رسوم پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ مقصد محض عقلی استدلال (استدلال
بالمعقولات) یا مشاہدۂ محسوسات پر قیاس کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا،
بلکہ اہل کتب اور اصحاب الآرا اور ارباب ملل کے متداول اور صحیح خیالات سے
مطلع ہونے اور ان معلومات کی بنا پر بجائے خود غور کرنے سے یہ گوہر مقصود
حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس بارے میں خود ان کے مختلف اقوال
اور خیالات کا موازنہ ضروری ہے۔

"لیکن سب سے پہلے واجب ہے کہ اپنے نفس کو ان عوارض اور اسباب
سے خالی کر لیا جائے جو اکثر لوگوں کو سچائی کے دیکھنے سے اندھا کر دیتے

ہیں، مثلاً ، عادت مالوفہ، تعصب، جوش فتحمندی، خود غرضی، خیالِ مقصد برآری وغیرہ وغیرہ، جس طریقے کا میں ذکر کر رہا ہوں یہی گوہر مقصود کو پانے اور شوائب شبہ و شکوک کے رفع کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس کے بغیر چاہے کتنی ہی سخت اعتنا اور کوشش کی جائے ناممکن ہے کہ یہ غرض پوری ہو جائے۔ لیکن اس کو میں مانتا ہوں کہ جو اصول اور طریقے ہم نے مقرر کئے ہیں، ان پر عمل پیرا ہونا سہل نہیں ہے، بلکہ بُعد اور صعوبت کی وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ ان تک پہونچنا ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تمام اخبار و روایات میں اکثر جھوٹی باتیں داخل ہو گئی ہیں اور ظاہر ایہ باتیں ناممکنات سے بھی نہیں معلوم ہوتیں کہ انھیں آسانی سے پہچان کر نکال دیا جائے۔ بہرحال ہم نے روایات و اخبار کو ممکن الوقوع تصور کر لیا اور بطور صحیح روایات کے مان لیا ہے بشرطیکہ دوسرے شواہد سے ان کا بطلان نہ ہوتا ہو۔ اس لئے کہ ہم احوال طبیعی میں خود ایسی باتیں دیکھتے ہیں اور ہم سے پہلے بھی لوگوں نے بار بار ایسی باتیں دیکھی ہیں کہ اگر ان کے مثل پچھلے زمانے کی کوئی روایت ہوتی تو ہم کہہ اٹھتے کہ یہ تو ناممکن ہیں۔ اس کے سوا عمر انسانی ایک ہی قوم کے اخبار جاننے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، پس یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بے شمار قوموں میں تمام قوموں کے اخبار معلوم ہو جائیں یہ قطعاً ناممکن ہے۔

"جب معاملات کی یہ کیفیت ٹھہری تو ہم پر واجب ہے کہ زیادہ قریب کی باتوں سے کم قریب کی باتیں اور زیادہ معلوم شدہ باتوں سے کم معلوم شدہ باتیں اخذ کریں اور جہاں تک ہو سکے انھیں صحیح کر دیں، روایات کو ان لوگوں سے ہم پہونچائیں جن کا تعلق روایات سے ہے، جہاں تک ہو سکے ان کی اصلاح اور درستی کی کوشش کریں اور باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں تاکہ ہمارے اس عمل سے طالب حق اور محب حکمت کو دوسرے مضامین کی تحقیقات اور ان امور کے دریافت کرنے کا موقع ملے جو ہمیں معلوم نہیں ہو سکے۔ ہم نے خدا کی مدد سے اسی پر عمل کیا ہے۔" (دیباچہ آثار باقیہ)

البیرونی کا طریقِ تحقیق تقابلی تھا۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ اُس شخص کے لئے آسان ہو سکتا ہے جو موجودہ مذاہب میں سے کسی کا پیرو نہ ہو، لیکن البیرونی کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا۔ وہ مذہب اسلام کا پیرو تھا اور ہم نے دیکھا کہ قانون مسعودی کے دیباچے میں

سید حسن برنی، البیرونی، صفحات ۱۴۳-۱۴۰

Marfat.com

متعلق براہ راست انھیں کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ کتاب الہند کے باب اول میں اُس نے اس سلسلے کی ان تمام مشکلات وموانع کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو سنسکرت زبان کے سیکھنے اور ہندوؤں کی کتابوں سے استفادہ کرنے کے دوران اسے پیش آئے۔ بلاشبہ یہ آسی کا بے پناہ صبر واستقلال اور اسی کی بے لچک قوت ارادی تھی جو اس راہ کی دشواریوں پر قابو پا سکی۔

الٰہی رحمتے برخاکِ او کن کرامت ہا بجانِ پاک او کن

میں برادر عزیز مسیح الحسن صاحب کا حد درجہ ممنون ہوں کہ پچھلے مہینے انھوں نے یہ مژدۂ جانفزا سنایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اُس مقالہ کی جس کا عنوان 'البیرونی اور جغرافیۂ عالم' ہے، ایک نقل ان کے پاس ہے، چونکہ یہ مقالہ جہاں تک ہمارے علم میں ہے، ابھی غیر مطبوعہ ہے، اس لئے ان سے ان کی نقل کی ہوئی کاپی لے کر ایک عالم اُس نے خدا اور اُس کے رسولؐ پر اپنے ایمان کا برملا اعلان کیا ہے، پھر وہ جس ماحول میں زندگی گذار رہا تھا، مذہب میں راسخ العقیدگی کا ماحول تھا۔ سلطان محمود کی فتحمندی کے جوش وخروش کا ماحول تھا، اُسے معلوم تھا کہ اس کی کتابیں اسی راسخ العقیدگی کی عام فضا میں پڑھی جائیں گی، پھر بھی وہ اپنے مطالعے میں پوری غیر جانبداری اور کمال معروضیت سے کام لیتا ہے اور کہیں بھی تعصب کی پرچھائیں نہیں پڑنے دیتا۔ وہ نہ تو اسلام کی برتری کا اعلان کرتا ہے اور نہ یہ جتاتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی وعلمی ترقی کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج بھی اس شعبۂ علم کے محققین میں شاذ ونادر ہی کوئی ایسا ملے گا جس میں البیرونی کی سی غیر جانبداری اور معروضیت ہو۔ اُس کے ساتھ یہ سعادت خاص عطیۂ الٰہی تھی۔

ہمارا یہ نابغۂ روزگار کئی زبانیں جانتا تھا، مثلاً سغدی اور خوارزمی (جو فارسی کی دو صورتیں تھیں)، عربی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت۔ اپنے مشہور ہمعصر ابن سینا اور دوسرے مسلم فلاسفہ کے مقابلہ میں اُس کا رتبہ یوں بھی بلند ہے کہ انھوں نے یونانی فلسفہ اس کے عربی تراجم سے سیکھا تھا۔ انھوں نے براہ راست یونانی زبان میں اسے نہیں پڑھا تھا لیکن البیرونی نے نہایت مشقت وجانفشانی سے سنسکرت زبان کی اپنی لغوی ونحوی مشکلات اور اہل ہند کے مخالفانہ رویے کے باوجود، سنسکرت سیکھی اور اتنی سیکھی کہ اس پر پورا عبور حاصل کیا، اور پھر اہل ہند کے فلسفہ وعلوم اور عقائد ورسوم سے

Marfat.com

خود زنگی میں پڑھی، خیال آیا کہ اسے چھپنا چاہئے چنانچہ میں انھیں لے کر آزاد بھون پہونچا اور اصل سے لفظ بہ لفظ اس کا مقابلہ کیا اور اس میں ضروری تصحیح کی۔ اس مخطوطے کی کہانی مسیح الحسن صاحب نے بیان کردی ہے جو دلچسپ اور معلومات افزا ہے مخطوطے میں عبارت اور املا جس طرح قلم بند ہیں انھیں اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے، البتہ میں نے کہیں کہیں ضروری حاشیے لکھ دیئے ہیں۔ مقدمہ لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ مجھ جیسا کم علم اور ہیچمداں شخص کے لئے یہ مناسب نہیں لیکن اس خیال سے میں نے جسارت کی ہے کہ مختلف علوم و فنون میں البیرونی کو جو امتیاز حاصل تھا اس کی ایک جھلک تو قارئین دیکھ ہی لیں اور ساتھ ہی اس فرد فرید کی زندگی کے حالات سے بھی انھیں کچھ واقفیت حاصل ہو جائے۔

اس مقدمہ میں میں نے خاص طور پر سید حسن برنی کے رسالے 'البیرونی' سے جس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا، استفادہ کیا ہے، لیکن پچھلے پچاس سال میں خود البیرونی کی بعض تصانیف دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہوئیں پھر اس کی یاد میں مختلف علوم کے ماہرین نے بیش قیمت تحقیقی مقالے لکھے اور البیرونی اور اس کے علمی کارناموں سے متعلق ایسی نئی نئی معلومات سامنے آئیں جو سید حسن برنی کے رسالے میں نہیں ملتیں اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ برنی کا رسالہ کئی لحاظ سے آج بھی اُن تمام عالمانہ تحریروں میں جو دنیا کی کسی زبان میں البیرونی کی زندگی اور اس کے علمی کمالات پر لکھی گئی ہیں، ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے مقالے کی تصنیف کے وقت اس رسالے کو ضرور پڑھا ہوگا۔

شکر گزار ہوں میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (آزاد بھون) کا کہ مولانا آزاد کے اس غیر مطبوعہ مقالے کی اشاعت کی اجازت دی اس کے لائبریرین گلزار احمد نقوی صاحب کا جنھوں نے مخطوطۂ مذکورہ کو دیکھنے، اسے پڑھنے اور اس سے استفادہ کرنے میں وہ تمام آسانیاں فراہم کیں جو ایسے کام میں ضروری ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائبریرین، شہاب الدین انصاری صاحب نے مطلوبہ کتابوں کی فراہمی میں پوری مدد کی، میرا جذبۂ منت گذاری ان کے لئے بھی ہے۔ شاہد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور عبداللطیف اعظمی صاحب کی سعی و توجہ کے بغیر اس کی طباعت میں بڑی دقتیں ہوتیں، میں ان کا بھی ممنون ہوں

ضیاء الحسن فاروقی
۲۳ر جون ۸۰ء

Marfat.com

کچھ مخطوطے کے بارے میں

مولانا ابوالکلام آزاد کا مقالہ "البیرونی اور جغرافیۂ عالم" ایک قلمی مخطوطہ ہے جو ۱۲½ × ۷½ سائز کے ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مخطوطے کے بعض صفحات پر مولانا کے قلم سے بعض اصلاحیں بھی ہیں۔ مولانا آزاد کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے، اس کا حوالہ سب سے پہلے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی کتاب مولانا ابوالکلام آزاد میں دیا ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ شاید اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عرش ملسیانی صاحب نے اپنی کتاب "ابوالکلام آزاد" (مطبوعہ ۱۹۷۴ء) میں اس کا ذکر کیا تھا۔ بجز حوالے اور اس مقالے کی موجودگی کی نشاندہی کے کسی نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ ڈاکٹر بیدار نے یقیناً اس مسودے کو انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی لائبریری میں اُن کتابوں کے ساتھ دیکھا تھا جو آزاد کلکشن کے نام سے جداگانہ ایک الماری میں محفوظ کر دی گئی تھیں۔ یہ کام میری ہی نگرانی میں اس وقت انجام دیا گیا تھا جب ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء میں کونسل پٹودی ہاؤس، کرزن روڈ، نئی دہلی سے موجودہ نئی عمارت آزاد بھون میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے آزاد کلکشن کا کوئی وجود نہ تھا۔ لہٰذا یہ مخطوطہ ۱۹۶۱ء سے پہلے سوائے آزاد بھون کی لائبریری کے اسٹاف کے کسی دوسرے کی نظر سے نہیں گذر سکتا تھا، ممکن ہے اجمل خاں صاحب مرحوم، جو ایک عرصے تک مولانا آزاد کے پرسنل سیکرٹری تھے، اس کے وجود سے واقف رہے ہوں۔

میں نے بھی اس کی اہمیت اس وقت سمجھی جب میں نے ۱۹۶۸ء میں مولانا کے حواشی پر کام شروع کیا۔[1] قریب قریب اسی زمانے میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور محمد عتیق صدیقی صاحب سے میری ملاقات آزاد بھون میں ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بیدار صاحب

۱۔ دوسرے مصنفین کی کتابوں کے حاشیوں پر لکھے ہوئے مولانا کے قلمی تبصرے میں نے الگ الگ کتاب کی صورت میں "حواشی ابوالکلام آزاد" کے نام سے مرتب کئے ہیں۔

Marfat.com

اپنی کتاب لکھنے میں مصروف تھے تو اکثر آزاد بھون کی لائبریری میں تشریف لاتے تھے۔ آزاد کلکشن کی الماری کی ایک ایک کتاب انھوں نے میری موجودگی میں دیکھی۔ اسی زمانے میں اس مخطوطے پر ان کی نظر پڑی اور اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا۔

مولانا آزاد سے متعلق مطبوعہ کتب و رسائل میں اس مخطوطے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی میں نے بہت کوشش کی۔ مولانا آزاد کی تصانیف دیکھیں، ان کے خطوط پڑھے، دوسروں کی تحریریں مطالعہ کیں، خاص کر ان ارباب علم و فضل کی جن سے مولانا کے علمی روابط تھے، مگر اس کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک بار محمد عتیق صدیقی صاحب نے دوران گفتگو فرمایا تھا کہ انھوں نے مولانا غلام رسول مہر کو اس سلسلے میں خط لکھا تھا کہ اس قسم کا ایک مخطوطہ آزاد بھون کی لائبریری میں موجود ہے؛ اس کے جواب میں مولانا موصوف نے عتیق صاحب کو لکھا کہ شاید ۱۹۴۷ء سے پہلے اس مقالے کا مسودہ بغرض اشاعت مولانا ابوالکلام آزاد نے لاہور بھیجا تھا لیکن یہ مقالہ اس وقت چھپ نہ سکا۔[1] مولانا مہر نے، بقول عتیق صدیقی صاحب، خدا کا شکر ادا کیا کہ مقالہ آزاد بھون کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ عتیق صدیقی صاحب اور مولانا مہر کے درمیان کس زمانے میں یہ مراسلت ہوئی، مجھ کو اس کا علم نہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ مقالہ مولانا نے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے میں کسی وقت لکھا ہے۔ مولانا کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں پر لکھنے والوں کی تحریریں شاہد ہیں کہ سیاسی اور ملکی مسائل میں بے پناہ مشغولیت کے باوجود مولانا کے علمی شغف میں کبھی کمی نہیں آئی، پھر بھی یہ مقالہ ان کے بالکل آخری زمانے کی تصنیف نہیں کہی جا سکتی۔ کتاب کے کچھ مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ مقالہ ۱۹۴۱ء کے بعد لکھا ہوگا، مقالے کے شروع میں مولانا آزاد نے البیرونی کی تصنیف القانون المسعودی کے مختلف نسخوں پر بحث کی ہے اور استنبول یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اے زکی ولیدی توغان کی البیرونی سے متعلق قابل ستائش تحقیقات پر روشنی ڈالی ہے، پروفیسر موصوف نے ترکی میں موجود القانون المسعودی کے چند نئے نسخوں اور البیرونی کی چند دیگر تصانیف کی نشان دہی کے بعد القانون کو از سر نو مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اپنی سعی و ہمت کے نتیجے میں پروفیسر توغان نے پوری کتاب کی اشاعت سے پہلے جغرافیۂ عالم کے متعلق القانون کی جدولوں کی ترتیب و تدوین کی اور انھیں ترکی میں دریافت شدہ البیرونی کی دو اور کتابوں، تحدید نہایات

---

[1] عتیق صاحب فرماتے ہیں کہ وہ خط ان کے پاس موجود ہے۔

Marfat.com

الاماکن اور التفہیم کے مستخرجات کے ساتھ صفتہ المعمورہ علی البیرونی کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی اور ایک دیباچہ بھی لکھا۔ پروفیسر توغان اگرچہ اپنے اس کام سے ۱۹۲۷ء میں فارغ ہو چکے تھے لیکن ان کی یہ علمی کاوش ۱۹۲۷ء سے پہلے کہیں شائع نہ ہو سکی، بالآخر سر جان مارشل کی توجہ سے گورنمنٹ آف انڈیا نے اس کتاب کو دہلی سے شائع کیا۔ مولانا آزاد نے نینی جیل میں اس کتاب کا مطالعہ ۱۹۴۱ء میں کیا تھا، کتاب کے سرورق پر مولانا کے دستخط مع تاریخ اس طرح موجود ہیں:

"ابوالکلام۔ نینی جیل۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۱ء"

پروفیسر توغان کی کتاب پر مولانا نے حاشیے بھی لکھے ہیں اور چونکہ پروفیسر مذکور کی فاضلانہ کوششوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس لیے قیاس یہی ہے کہ مولانا نے اپنا یہ مقالہ ۱۹۴۱ء کے بعد لکھا، جب ہی یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ بقول مولانا غلام رسول مہر (بہ روایت جناب عتیق صدیقی) یہ کتاب ۱۹۴۷ء سے پہلے برائے اشاعت لاہور بھیجی جائے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، مولانا آزاد نے اپنے مقالے کی بنیاد پروفیسر توغان کی صفتہ المعمورۃ پر رکھی ہے۔ پروفیسر توغان کی کتاب ۱۹۲۷ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۷ء میں سید حسن برنی کی کتاب البیرونی کا دوسرا اڈیشن کافی ترمیم و تنسیخ اور اضافے کے بعد چھاپا گیا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ سید حسن برنی اور پروفیسر توغان تقریباً ایک ہی زمانے میں البیرونی کے علمی کارناموں پر تحقیقات کر رہے تھے، لیکن ایک دوسرے کی کوششوں سے بے خبر تھے۔

پروفیسر توغان نے القانون المسعودی کی جدولوں کی ترتیب میں القانون کے چند نئے دریافت شدہ نسخوں کے علاوہ تین دوسری نئی حاصل شدہ کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ ان تین نئی کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن

۲۔ الجماہر فی معرفت الجواہر

۳۔ التفہیم

سید حسن برنی نے اپنی کتاب میں البیرونی کی تصانیف کی جو فہرست درج کی ہے اس میں یہ تینوں کتابیں شامل ہیں، لیکن پروفیسر توغان کی تحقیقات اور جد و جہد کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ ۱۹۵۱ء میں ایران سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہونے والی رجس کا مفصل ذکر آگے آئے گا، البیرونی کی ہزار سالہ یادگار جلد کے ایک مقالے میں اور ایران سوسائٹی ہی کے ایک جلسے میں، ۲۴ر مارچ ۱۹۵۲ء کو البیرونی کی سائنسی خدمات پر ایک

Marfat.com

مقالہ پیش کرتے ہوئے، سید حسن برنی نے جا بجا پروفیسر توغان کی صفۃ المعمورہ اور ان کی چند دیگر تالیفات کے حوالے دیئے ہیں۔ سید حسن برنی کے یہ دونوں مقالے انگریزی میں ہیں۔ مولانا آزاد نے بھی اپنے اس مقالے میں سید حسن برنی کے مقالوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر بحث تصنیف کا جو زمانہ ہم نے متعین کیا ہے، قریب قریب اسی زمانے میں ہندوستان اور دوسرے ممالک میں البیرونی پر مزید تحقیقاتی کام کئے گئے۔ ۱۹۴۸ء کو سنہ ہجری کے لحاظ سے البیرونی کا ہزار سالہ یادگار سال قرار دیا گیا۔

۱۹۴۶ء میں ایران سوسائٹی، کلکتہ نے ایک پروگرام مرتب کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں البیرونی کی ہزار سالہ تقریبات منعقد کی جائیں، مگر ان تقاریب کا انعقاد اس وقت ملک کی حالیہ آزادی کی وجہ سے ملتوی ہو گیا، تاہم بین الاقوامی شہرت کے اسکالروں کے مقالات پر مشتمل ایک یادگار جلد کی ترتیب کا سلسلہ جاری رہا اور یہ جلد ۱۹۵۱ء میں مکمل ہو کر ایران سوسائٹی، کلکتہ سے شائع ہو گئی۔ ۱۹۴۸ء کی مجوزہ ہزار سالہ تقاریب مارچ ۱۹۵۲ء میں منائی گئیں، اس موقع پر اس یادگار جلد کا اجراء ہوا۔ یہ جلسہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت اُس وقت کے مغربی بنگال کے گورنر جناب ایچ، سی، مکرجی نے فرمائی۔ ان تمام کوششوں کو حکومت ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کی علمی تائید حاصل رہی۔ یادگار جلد کی دو سو کاپیاں مولانا کی سفارش پر حکومت ہند کے لئے وقف کر دی گئیں۔ ان تقاریب کے انعقاد کا اہتمام انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی جانب سے ہوا۔ یہ ادارہ اُس زمانے میں وزارت تعلیم سے وابستہ تھا اور مولانا آزاد وزیر تعلیم کی حیثیت سے اس کے صدر تھے۔ مولانا کی اس نمایاں وابستگی کے باوجود ان تقاریب میں ان کی براہ راست شرکت کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی ان کے اس مقالے کا کسی پہلو سے کوئی سُراغ ملتا ہے۔

ہندوستان کی اس یادگار تقریب کے علاوہ جولائی ۱۹۴۸ء میں پیرس میں بین الاقوامی مستشرقین کی اکیسویں کانگریس کے زیر اہتمام ایک خصوصی اجلاس البیرونی کی ہزار سالہ یادگار کے سلسلے میں منعقد ہوا جس میں دنیا بھر کے ارباب علم و فضل نے البیرونی کے عظیم کارناموں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ہندوستان کی نمائندگی پروفیسر سنتی کمار چٹرجی نے کی۔

ہجری تقویم کے لحاظ سے البیرونی کی ہزار سالہ یادگار منانے کے موقع پر اس عظیم المرتبت محقق و مفکر کے بارے میں جو تحقیقاتی کام ہوا اور جس تک میری رسائی ہو سکی، یہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے، عین ممکن ہے کہ دنیا کے دوسرے گوشوں میں کچھ مزید تحقیقات ہوئی ہوں۔ سنہ عیسوی کے لحاظ سے ۱۹۷۳ء میں البیرونی کی ہزار سالہ یادگار منانے کا دوسرا دور شروع ہوا، یہ مولانا آزاد کی وفات کے بعد کا دور ہے۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں ایران

Marfat.com

میں ایک بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی جس میں اطراف عالم کے ماہرین مشرقیات نے شرکت کی۔ اس کانگریس کے اجلاس کئی دن تک جاری رہے اور مشہور و معروف شخصیتوں نے تحقیقی مقالے پڑھے۔ ان مقالوں پر مشتمل دو ضخیم جلدیں، نامۂ بیرونی کے نام سے شورائی عالی فرہنگ و ہنر نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیں، پہلی جلد میں فارسی مقالات ہیں، دوسری جلد انگریزی اور فرانسیسی مقالات پر مشتمل ہے۔ پاکستان میں بھی یہ یادگار، عالمی پیمانے پر منائی گئی اور پاکستان کی وزارتِ تعلیم، یونسکو اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے باہمی اشتراک اور اتحادِ عمل سے یہ کام بڑے تزک و احتشام کے ساتھ صورت پذیر ہوا اور ۱۹۷۹ء میں ہمدرد اکیڈمی کراچی نے البیرونی سے متعلق تحقیقی مقالات پر مشتمل ایک نہایت شاندار کتاب شائع کی۔

آخر میں یہ اظہار کر دینا ضروری ہے کہ اس مخطوطے پر مولانا آزاد کے دستخط کہیں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی مخطوطہ نویس نے ان کا نام تحریر کیا ہے۔ البتہ جلد بندی کے وقت تختۂ جلد کے وسط میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مولانا کا اسم مبارک ثبت کر دیا گیا ہے۔ مخطوطے پر نام نہ ہونے کی وجہ سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ مولانا کی تصنیف نہ ہو، لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ مخطوطہ کسی دوسرے شخص نے لکھا اور مولانا نے بعد میں اصلاح کی۔ اصلاح یقیناً مولانا کے ہاتھ کی ہے جس کی صحت میں کسی شبہے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے اصلاح کی تحریر کو مولانا کی دوسری تحریروں سے موازنہ اور تقابل کر کے دیکھا ہے اور انھیں ایک دوسرے سے بالکل مماثل پایا۔ نیز مولانا کی اس تصنیف کا طرزِ نگارش ان کی دوسری نگارشات سے بالکل مشابہ ہے۔ حقائق و واقعات کی تلاش و جستجو کے بعد ان کو دلائل و براہین کے ساتھ مربوط و منضبط کر کے نتائج اخذ کرنے اور بیان کو موثر بنانے کا جو طریقہ مولانا نے اپنی دوسری تحریروں میں اختیار کیا ہے وہی اس کتاب کی عبارت میں بھی موجود ہے۔ ان حقائق و شواہد کی روشنی میں اس مختصر رسالے کو مولانا کی تصنیف تسلیم کر لینے میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

ناشکری ہوگی اگر میں اس شہ پارے کو منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں ایک محترم اور علم دوست شخصیت اور چند دوسرے معزز دوستوں کا شکریہ ادا نہ کروں۔ ان اصحاب کی مساعی جمیلہ کی بدولت اس کام کی اشاعت ایسے وقت میں ممکن ہوئی جبکہ میں بالکل ناامید ہو چکا تھا۔ یہ شخصیت جناب ضیاء الحسن فاروقی کی ہے جو جامعہ کالج

Marfat.com

کے پرنسپل، ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر اور اس کے سہ ماہی رسالے، اسلام اینڈ دی موڈرن ایج (انگریزی)، اسلام اور عصر جدید (اردو) اور ماہنامہ جامعہ کے مدیر ہیں۔ ضیاء صاحب نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کی ترتیب وتدوین کی اور چند ضروری حاشیے لکھے اور پھر اپنے علمی ذوق کی وجہ سے اس رسالے کی اشاعت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اب بطور مقدمہ البیرونی پر ایک جامع مضمون لکھ کر اپنی نگرانی میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے شائع کرا رہے ہیں۔

جناب شہاب الدین انصاری، لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جناب ڈاکٹر محمد ذاکر، ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ان معزز دوستوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے بروقت اور مفید افکار اور مشوروں سے میری مدد فرمائی۔ میں ان کا بے حد شکر گذار ہوں، جناب گلزار احمد نقوی، لائبریرین، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، آزاد بھون کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی لائبریری میں اس مخطوطے سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جناب خواجہ منیر احمد، جونیر لائبریرین، آزاد بھون کا بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں، موصوف آزاد کلکشن کے انچارج ہیں اور مجھ کو ہمیشہ ان کا تعاون حاصل رہا۔

مسیح الحسن
۲۱ر جون ۱۹۸۰ء

Marfat.com

البیرونی اور جغرافیۂ عالم

القانون المسعودی

ابوریحان البیرونی نے جغرافیہ اور ہیئت کے مباحث پر متعدد کتابیں لکھی تھیں اور اپنے پیشروؤں کی بیوں کی تصحیح کی تھی۔ وہ جب "کتاب الہند" کی تصنیف سے فارغ ہو چکا تو اُسے خیال ہوا کہ اب ایک ایسی جامع کتاب مرتب کرنی چاہیے جس میں ان تمام مباحث کا خلاصہ یک جا ہو جائے۔ اس کی زندگی کا یہ آخری زمانہ فراغت اور خوشحالی کا زمانہ تھا کیونکہ اب سلطان محمود غزنوی کی جگہ (جس سے اُس کے تعلقات ہمیشہ کدر اور مشتبہ رہے) اس کا علم دوست لڑکا سلطان مسعود تخت نشین تھا اور البیرونی کے علم و فضل کی منزلت شناسی کے لیے سازگار فضا پیدا ہو گئی تھی۔ قدرتی طور پر صورت حال کی اس تبدیلی نے بھی ایک مزید محرک کا کام دیا اور غالباً ۱۰۳۶ء میں اس نے سلطان مسعود کے نام سے معنون کر کے القانون تصنیف کی۔ یہ کتاب جیسا کہ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ نے بجا طور پر لکھا ہے البیرونی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے (دیباچہ کتاب الہند، صفحہ ۱۱)۔

یہ کتاب گیارہ مقالوں پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ میں نو سے لے کر سترہ تک ابواب ہیں۔ اُس کے پانچویں مقالہ کے نویں اور دسویں باب میں کرۂ ارضی کے آباد حصے کی صورت پر بحث کی گئی ہے اور دنیا کی تمام آبادیوں کے طول بلد اور عرض بلد (لیٹی ٹیوڈ اور لانگی ٹیوڈ) معلوم کرنے کے لیے جدولیں (ٹیبلس) مرتب کر کے شامل کی ہیں۔ یہ جدولیں جنہیں اُس عہد کی جغرافیائی تحقیقات کا بہترین خلاصہ سمجھنا چاہیے فن جغرافیہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ غالباً عرب جغرافیہ نویسوں میں البیرونی پہلا شخص ہے جس نے اپنے عہد کی دنیا کو طول بلد اور عرض بلد کی جدولوں میں مکمل طور پر منضبط کیا۔ البیرونی کے بعد متعدد رصدگاہیں اسلامی ممالک میں قایم ہوئیں اور ہر رصدگاہ نے اپنی اپنی جدولیں مرتب کیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی

البیرونی کی تحقیقات سے بے نیاز نہ ہو سکا۔ چنانچہ علمائے جغرافیہ میں سے ابوالفداء اور یاقوت نے ان جدولوں سے استفادہ کیا ہے اور رصدگاہ کے علماء میں سے طوسی، الغ بیگ اور قوشجی اپنی اپنی جدولوں کی ترتیب میں ان سے مدد لینے کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی ہمیں پیش نظر رکھنی چاہیے کہ البیرونی کے بعد جن لوگوں نے جدولیں مرتب کیں اُن کے پاس رصدگاہیں موجود تھیں اور شاہانہ فیاضیوں نے ہر طرح کا ضروری سامان مہیا کر دیا تھا۔ مثلاً الغ بیگ خود فرماں روا تھا اور علامہ قوشجی کے لیے رصدگاہ سمرقند کا تمام سروسامان مہیا ہو گیا تھا، لیکن البیرونی کو نہ تو کوئی شاہی سرپرستی مل سکی اور نہ کوئی مکمل رصدگاہ اُس کے لیے وجود میں آسکی، اُس نے جو کچھ کیا محض اپنی شخصی جدوجہد سے کیا اور اس لیے جس درجہ اُسے کامیابی حاصل ہوئی وہ اس کی ذاتی کامیابی تھی۔

البیرونی سے ساٹھ ستر سال پہلے الادریسی نے راجر[1] شاہ سسلی کی فرمایش سے اپنا مشہور عالم کرہ تیار کیا تھا اور اس کی تشریح میں "نزہتہ المشتاق" لکھی تھی۔ الادریسی کے نقشہ کو صدیوں تک اعتماد و قبولیت کی سند حاصل رہی اور سولھویں صدی مسیحی تک یورپ کے جہازراں اور جغرافیہ نویس اُسی سے کام لیتے رہے لیکن جہاں تک جغرافیائی معلومات کا تعلق ہے الادریسی نظر و تحقیق کا وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو ستر برس کے بعد البیرونی حاصل کرنے والا تھا۔ الادریسی ان تمام معلومات کا جو اُس کے عہد تک روشنی میں آچکی تھیں ایک محتاط ناقل تھا، لیکن محقق نہ تھا برخلاف اُس کے البیرونی ایک محقق اور مجتہد تھا۔ اس نے محض قدماء کی تحقیقات کے نقل کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق و کاوش سے اس فن کو از سرِ نو مدون کر دیا۔

علاوہ بریں دونوں کی نظر و معلومات کا دایرہ بھی ایک نہ تھا۔ الادریسی کے سامنے صرف بطلیموس (Ptolemy) کی دنیا تھی اور اگر اس پر نئی معلومات کا کچھ اضافہ ہوا تھا تو وہ صرف وسط افریقہ کے بعض

۱۔ سسلی کا نارمن بادشاہ راجر ثانی (Roger II) جس کے ایما پر الادریسی نے اپنے "کرہ" کی تشریح میں کتاب نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی تھی اور جسے کتاب روجاری اور الکتاب الروجاری بھی کہتے ہیں۔

Marfat.com

حصّوں اور مشرقی یورپ کی بعض جغرافیائی تفصیلات تھیں۔ لیکن البیرونی نے وسط ایشیا، افغانستان، چین اور ہندوستان کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا کیں اور ہر اہم مقام کی نسبت سائنٹیفک طریقے سے جس قدر رصدی تحقیقات کی جا سکتی تھیں وہ سب انجام دیں۔ ساتھ ہی ان تمام تحقیقات سے فایدہ اٹھایا جو اس کے عہد میں مغربی ایشیا کے دوسرے محققوں اور ہیئت دانوں نے اپنے اپنے دایروں میں انجام دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ البیرونی کی دنیا ہمیں الادریسی کی دنیا سے زیادہ روشن اور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بطلیموس کی دنیا سے بہت آگے بڑھ آیا ہے اور اس کی تحقیقات کی سرحد زمانۂ حال کی تحقیقات کی سرحد سے بہت زیادہ قریب ہے۔

جو مایوسی ایلیٹ کے حصے میں آئی تھی وہ آگے چل کر ان تمام مستشرقوں کے حصے میں آنے والی تھی جو ایلیٹ کے نقش قدم پر قدم اٹھانے والے تھے۔ ایلیٹ کا نسخہ اُس کے تمام مخطوطات کے ساتھ برٹش میوزیم کے کتب خانہ کی حفاظت میں آگیا تھا۔ ڈاکٹر اسپرنگر (Sprenger) نے اپنی کتاب "Die Post — und Reiserauten Des Orients." مرتب کرتے ہوئے یہ نسخہ استعمال کیا تھا لیکن وہ بھی زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا جن مقامات میں کتابت کی تصحیف سے مطالب خبط ہو گئے تھے ان کی تصحیح کی کوشش میں نئی نئی غلطیاں پیدا ہو گئیں اور پھر یہ غلطیاں بعد کی مصنفات میں برابر متعدی ہوتی رہیں۔ مثلاً بدخشاں کے قریب ایک قصبہ "وخان" تھا جہاں سے بدخشاں کے مشہور عالم لعل نکلتے تھے اور انھیں بدخشاں میں لاکر جلا دیتے تھے۔ البیرونی نے اپنی جدول میں لکھا ہے "وخان فی حدود معاون اللعل وجلاؤہ ببدخشاں" یعنی "وخان" لعل کی کانوں کے حدود میں ہے جنہیں بدخشاں میں لاکر جلا دیتے ہیں۔ ایلیٹ کے نسخے کے کاتب نے "وخان" کو "رحال" اور "بدخشاں" کو "سدجان" کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساری عبارت خبط ہو گئی اور اسپرنگر نے تصحیح کی کوشش میں یہ مطلب نکالا کہ رحال جلاوہ اور سدجان تین شہر ہیں اور عبارت کا مطلب یہ ہے کہ "رحال، لعلوں کی کانوں کے حدود میں ہے۔ نیز شہر جلاوہ اور سدجان بھی وہیں ہیں۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس کتاب کا ایک دوسرا نسخہ جو یورپ کے مستشرقوں کے مطالعہ میں آیا وہ برلن کے کتب خانہ کا نمبری ۲۷۵ ہے۔ ڈاکٹر ای۔ وائڈمین (E. Wiedemann) نے ایلیٹ کے نسخے کے

یہ نسخہ بھی سامنے رکھا اور جدول کی تصحیح کی کوشش کی مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ غور وخوض کے بعد معلوم ہوا کہ برلن کا نسخہ کام کی اصلی مشکلات کے حل میں بہت کم مدد دے سکتا ہے۔ بالآخر انھوں نے صرف اس پر قناعت کی کہ پانچویں مقالہ کے نویں باب کا ترجمہ شائع کردیں۔ چنانچہ یہ ترجمہ شائع ہوگیا مگر اسقام سے خالی نہیں ہے۔

ان نسخوں کے علاوہ ایک تیسرا نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی ہے اور غالباً سب سے زیادہ پرانا ہے۔ کیونکہ اس کی تاریخ کتابت ۴۷۵ھ ہے۔ یعنی البیرونی کی وفات کے تقریباً ۳۵ سال بعد۔ مگر افسوس ہے کہ یہ نسخہ ناقص ہے۔ تقریباً ایک تہائی حصہ ابتدا کا اس میں نہیں ہے اور صحت کے لحاظ سے بھی بہتر نہیں۔

ہندوستان کے کتب خانوں میں بھی اس کے دو نسخے پائے گئے ہیں ایک امپیریل لائبریری کلکتہ میں ہے۔ دوسرا بمبئی کی ملا فیروز لائبریری میں ہے۔

امپیریل لائبریری کے نسخے کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ نسخہ ۵۶۲ھ میں ایک شخص ابوالفتح نصر بن محمد بن ہبۃ اللہ نے کسی دوسرے نسخے سے نقل کیا تھا۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں یہ تصریح موجود ہے۔

" وفرغ من تسویدہ ابوالفتح نصر بن محمد بن ھبۃ اللہ فی سلخ ربیع الآخر سنۃ اثنتی وستین وخمس مأۃ الموافق بہروز ابان من ماہ اسفندار من سنۃ ست و خمسین مأۃ "

اگر البیرونی کی وفات کی وہ روایت تسلیم کرلی جائے جس سے ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء میں اس کا وفات پانا ثابت ہوتا ہے تو یہ نسخہ اس کی وفات سے ایک سو پچیس برس بعد لکھا گیا تھا۔ ۶۱۸ھ میں یہ نسخہ ایک شخص اوحد بن اسعد بن بہرام البیہقی کی ملکیت میں آیا۔ چنانچہ کتاب کے پہلے صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے۔

" من عواری الزمان دخل فی نوبۃ العبد الجانی افقر خلق اللہ واحوجھم الیہ اوحد بن اسعد بن بہرام المستوفی البیہقی فی شہر شعبان المعظم من شہور ثمان عشر وثمان مأۃ الھجرۃ النبویہ "

معلوم ہوتا ہے اوحد بن اسعد کے بعد یہ نسخہ مختلف شخصوں کے قبضے میں آیا

Marfat.com

انھوں نے اپنی اپنی مہریں اس پر ثبت کیں۔ لیکن اب یہ مہریں پڑھی نہیں جاتیں کیونکہ کسی شخص نے اُنھیں کوشش کرکے مٹادیا ہے۔ پھر آخری صفحے میں دو مہریں صاف صاف نمایاں ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں ایک ہی نام درج ہے "فاضل خاں بندۂ شاہجہاں" ان مہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں یہ نسخہ فاضل خاں کے پاس تھا۔ چونکہ اس فاضل خاں کے حالات سے ہم بے خبر نہیں ہیں اس لیے اس منزل پر پہنچ کر اس کے ورودِ ہند کا صحیح زمانہ متعین کرلیا جاسکتا ہے۔

فاضل خاں کا نام علاء الملک تونی تھا۔ یہ شاہجہاں کے جلوس کے ساتویں سال ایران سے ہندوستان آیا اور اپنے فضل وکمال کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ ابتدا میں پان صدی منصب پر مقرر ہوا۔ پھر تمام ممالک محروسہ کی تنخواہوں کی دیوانی اور عرض مکرر کی داروغگی کے اعلیٰ عہدے تک پہنچ گیا اور جلوس کے اٹھائیسویں سال فاضل خاں کے خطاب سے ملقب اور سہ ہزاری منصب سے سرفراز ہوا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے نامہ و پیام کی سرگذشت میں جس فاضل خاں کا نام بار بار آتا ہے وہ یہی فاضل خاں ہے۔ بعض مورخوں کا بیان ہے کہ فاضل خاں نے اپنی خوش بیانی کے زور سے اورنگ زیب کو اس پر آمادہ کرلیا تھا کہ قلعہ آگرہ میں جاکر باپ سے ملاقات کرلے، لیکن شائستہ خاں اور شیخ میر کی غمازیاں مانع ہوئیں اور اورنگ زیب آمادگی ظاہر کرکے پھر پھر گیا۔ اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد فاضل خاں کی قدر افزائی میں کمی نہیں کی تھی اور وزارت کے منصب پر مامور کردیا تھا لیکن اب عمر نے بے وفائی کی۔ مسندِ وزارت پر بیٹھتے ہی مرض الموت میں مبتلا ہوا اور ۱۰۷۳ھ میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مرنے سے پہلے یہ شعر بار بار اس کی زبان پر طاری ہوا تھا:

امید بستہ برآمد ولے چہ فائدۂ زانک
امید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید

صاحبِ مآثر الامراء نے اس کے حالات میں لکھا ہے کہ فنونِ حکمت طبیعی میں یکتائے روزگار تھا خصوصاً علم ہیئت و نجوم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ لاہور کی نہر جو علی مردان خاں کے حکم سے اس کے ایک مصاحب نے تعمیر کی تھی، مگر بعض نقائص کی وجہ سے خشک پڑی تھی، وہ اسی فاضل خان کی حکمت و صناعی سے جاری ہوگئی کیونکہ فن آب ترازو میں (یعنی پانی کے چڑھانے کے فن میں) وہ پوری مہارت

Marfat.com

رکھتا تھا (جلد سوم، صفحہ ۵۲۴)۔
مارٹن نے ایرانی اور مغل عہد کی تصاویر کا جو مجموعہ شایع کیا ہے اس میں

فاضل خاں کی تصویر موجود ہے جو اس عہد کے مشہور مصوّر نادر سمرقندی نے کھینچی تھی۔
فاضل خاں لاولد تھا، لیکن اس کے بعض رشتہ دار فرّخ سیر کے عہد تک مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ آخری منصب دار مُلّا ضیاء الدین تھا۔ جس نے فرّخ سیر کے عزل کے بعد انتقال کیا (جلد سوم، صفحہ ۳۸)۔ بہت ممکن ہے کہ اسی عہد میں اس کا کتب خانہ منتشر ہوا ہو۔
فاضل خاں کے خاندان کے قبضے سے نکل کر یہ کتاب مولوی صدر الدین احمد کے قبضے میں آئی۔ مولوی صدر الدین بُہار ضلع بردوان (بنگال) کے رہنے والے تھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں علوم درسیہ کی تکمیل کی تھی۔ انھوں نے بُہار میں اپنے ذاتی مصارف سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا، اور شمالی ہند کے بعض مشہور علماء کی خدمات اس کے لیے حاصل کی تھیں۔ بعض مذہبی مسایل پر ان کے رسایل کلکتہ میں چھپ چکے ہیں اور میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں جب لارڈ کرزن نے امپیریل لائبریری قایم کی تو ان کے خاندان کے بعض ارکان نے اپنا خاندانی کتب خانہ گورنمنٹ کے حوالے کر دیا کہ لائبریری کی ایک شاخ کی صورت میں قایم رکھا جائے۔ چنانچہ اس طرح یہ نسخہ امپیریل لائبریری کے قبضہ میں آگیا۔ انسانوں کی طرح کتابوں کی زندگیوں کی بھی سرگزشتیں ہوتی ہیں۔ آٹھ صدیوں کی جہاں نوردی کے بعد یہ کتاب اب کلکتہ کی ایک عمارت میں مقیم ہے۔
یہ نسخہ عرصے تک میرے مطالعے میں رہا ہے۔ عربی عبارت کی عام اغلاط اس میں کم ہیں، لیکن جہاں تک ہندوستانی ناموں کی تصحیف اور علمی مصطلحات و اعلام کے خبط و تغیر کا تعلق ہے یہ نسخہ بھی یورپ کے نسخوں کی طرح ناقابل اعتماد ہے۔

پروفیسر توگان کی کامیابی

جبکہ علمی دنیا البیرونی کی زندگی کے اس سب سے بڑے کارنامے کی تصحیح و اشاعت سے مایوس ہو چکی تھی تو اچانک ایک ایسے گوشے سے امید کی روشنی چمکی جس سے اس طرح کی خدمات کی بہت کم توقع کی جا سکتی تھی۔ یعنی استنبول کے ایک عالم۔ اے۔ زکی توگان نے جو استنبول یونیورسٹی میں ترکی تاریخ کے استاد ہیں اس کام کی انجام دہی کا ارادہ کیا اور جس راہ کے طے کرنے سے ان کے تمام پیشرو مایوس ہو چکے تھے اسے اپنی انتھک

Marfat.com

کوششوں سے طے کر لیا۔

اس کامیابی میں پروفیسر توگان کی خوش قسمتی کو بھی بہت کچھ دخل ہے جو اُن کے پیشروؤں کے حصے میں نہ آسکی۔ انھیں استنبول اور قونیہ کے قدیم کتب خانوں سے القانون کے متعدد نسخے ایسے دستیاب ہو گئے جو اس وقت تک علمی دنیا کے سامنے نمایاں نہیں ہو سکے تھے۔ ان میں سے دو نسخے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ یورپ اور ہندوستان کے نسخوں سے زیادہ صحیح اور منضبط ہیں اور کام کی تمام مشکلوں کو بہت حد تک حل کر دیتے ہیں۔ ان نسخوں میں پہلا نسخہ جامع بایزید کے کتب خانہ ولایتین آفندیؒ کا ہے۔ اس کی صحت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس لیے تصحیح و ترتیب کے لیے اسے بنیادی نسخہ قرار دیا گیا۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ استنبول اور قونیہ کے کتب خانوں کے بے شمار نوادر ہیں جو اس وقت تک منظر عام پر نہیں آسکے ہیں۔ یہ کتب خانے مختلف بادشاہوں کے وقتوں میں مساجد کے مدرسوں کے لیے وقف کیے گئے لیکن نہ تو باقاعدہ الماریوں میں کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھی گئیں نہ کسی نے ان کی فہرست بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ اکثر کتب خانے اس حالت میں ہے کہ ہر علم و فن کی کتابیں ایک دوسرے سے ملی جلی اوپر تلے جمع کر دی گئیں اور جا بجا اُن کے ڈھیر لگ گئے۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد حکومت کے نظارت معارف و اوقاف نے اس طرف توجہ کی تھی اور ایک کمیشن مقرر کیا تھا لیکن کتابوں کی ترتیب اور فہرستوں کی تدوین کا کام پھر بھی انجام نہ پا سکا۔ اب کئی سال سے پھر یہ کام شروع کیا گیا ہے اور تمام سرکاری اور غیر سرکاری کتب خانوں کو ایک کتب خانے کی حیثیت دے کر اس کی فہرست مرتب کی جا رہی ہے۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ دنیا کے تمام علمی حلقے القانون کا صحیح نسخہ ڈھونڈتے رہے اور انھیں کوئی سراغ نہیں ملا حالانکہ استنبول اور قونیہ کے ڈھیروں میں ایک سے زیادہ نسخے روپوش تھے۔

صفتہ المعمورہ علی البیرونی

پروفیسر توگان نے بجا طور پر محسوس کیا کہ اس جدول اور جدول کے مقدمہ کی اشاعت کو پوری کتاب کی اشاعت پر موقوف نہیں رکھنا چاہئے اور اسے پہلے شایع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے جدول کی تصحیح کا کام شروع کر دیا۔ اب خوش قسمتی نے ان کا اور زیادہ ساتھ دیا اور

Veliyettin Efendi (ولی الدین آفندی)

Marfat.com

استنبول کے کتب خانوں سے البیرونی کی تین دوسری کتابیں بھی مل گئیں۔
(۱) تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن یعنے سائنٹفک جیوگریفی کے طریقوں کا بیان۔
(۲) الجماہر فی معرفتہ الجواہر۔ جواہرات کی انواع و اقسام کی تحقیق۔
(۳) الصیدنتہ۔ مفرد دواؤں کی تحقیقات۔

ان میں پہلے رسالے کا نسخہ نہایت درجہ قیمتی ہے، کیونکہ خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ نسخہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے "وقد فرغت منہ بغزنہ سبع بقین من رجب سنہ ست عشر واربع مایہ" یعنی ۲۲ یا ۲۳ رجب ۴۱۶ھ کو غزنہ میں میں اس رسالے کی تسوید سے فارغ ہوا۔

چنانچہ پروفیسر موصوف نے ان تینوں کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا اور جس قدر مواد ان میں ایسا ملا جو براہ راست یا بالواسطہ جغرافیۂ عالم سے تعلق رکھتا تھا اسے بھی قانون کی جدول اور اس کے مقدمے کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس طرح ایک نہایت مفید اور دلچسپ مجموعہ مرتب ہو گیا جسے انھوں نے "صفتہ المعمورہ علی البیرونی" یعنی "بیرونیز پکچر آف دی ورلڈ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

طباعت کی مشکلات

پروفیسر توگان کو اس مجموعے کی اشاعت میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور جن کی وجہ سے چودہ برس تک اس کی اشاعت ملتوی رہی وہ بجائے خود ایک افسوس ناک داستان ہے۔ وہ ۱۹۲۷ء میں جدول کی تصحیح سے فارغ ہو گئے تھے اور سرکاری مطبع استنبول میں اس کی چھپائی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی صرف چند صفحے چھپ سکے تھے کہ حکومت نے عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف اختیار کرنے کا فیصلہ نافذ کر دیا اور عربی حروف کی طباعت حکماً روک دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری پریس نے نہ صرف کتاب کی طباعت ہی روک دی بلکہ جتنے صفحات چھپ چکے تھے انھیں جلا دینا بھی ضروری سمجھا۔ چونکہ اب ترکی میں اس کے چھپنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، اس لیے انھوں نے روس کی اکاڈیمی آف سائنس سے خط و کتابت کی اور پروفیسر برتھولڈ کی طرف سے انھیں امید افزا جواب ملا تھا۔ اس خیال سے کہ اب کتاب روس میں شایع ہو گی انھوں نے روسی زبان میں اس کا ترجمہ بھی شروع کر دیا تھا لیکن ابھی کام آگے نہیں بڑھا تھا کہ پروفیسر برتھولڈ کا انتقال ہو گیا اور اسی طرح روسی اکاڈیمی سے مدد ملنے کی توقع پوری نہ ہو سکی

Marfat.com

تو سر اورل اسٹین Sir Aurel Stien کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ سر اورل کے ذریعے سے سرجان مارشل کے علم میں یہ معاملہ آیا اور انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کے آرکیالاجیکل ڈپارٹمنٹ کو اس پر توجہ دلائی۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہ آخری کوشش ناکامیاب نہ رہی اور ڈپارٹمنٹ نے اس کی طباعت کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ اب یہ مجموعہ دہلی سے چھپ کر شایع ہو گیا ہے اور ملک کو امید دلائی گئی ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی عنقریب بہت جلد شایع کر دیا جائے گا جس کی تیاری میں آج کل پروفیسر توگان مشغول ہیں۔

اس سلسلے میں یہ حسنِ اتفاق بھی قابل ذکر ہے کہ البیرونی کی کتاب الہند اور اس کا انگریزی ترجمہ انڈیا آفس لنڈن کی اعانت سے شایع ہوا تھا اور اب پچپن سال کے بعد اس کی ایک دوسری کتاب بھی گورنمنٹ آف انڈیا ہی کی اعانت سے شایع ہو رہی ہے۔

حکومت ترکی نے اس قیمتی علمی خدمت کے ساتھ جو تغافل برتا اس پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ استنبول یونیورسٹی کا ایک پروفیسر سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد ایک ایسی کتاب کی تصحیح میں کامیاب ہوتا ہے جس کی تصحیح کی طرف سے یورپ کے تمام مستشرق حلقے مایوس ہو چکے تھے لیکن خود اس کے ملک کی قدردانیوں کا یہ حال ہے کہ وہ اس کی اشاعت کا بھی سروسامان نہیں کر سکتا اور اسے چودہ سال تک دوسرے ملکوں کے اہل علم سے ہمرہی و اعانت کی طلب گاریاں کرنی پڑیں۔

حکومت ترکی نے حروف کی تبدیلی کا فیصلہ جن اصلاحی مقاصد کے ماتحت کیا اس کی نسبت یہاں اظہار رائے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کوئی اصلاح کتنی ہی اہم ہو اگر اس کے غلو کو مجنونانہ انتہا تک پہنچا دیا جائے گا تو وہ اصلاح اصلاح نہیں رہے گی بجائے خود ایک اِفساد بن جائے گی۔ حروف کی تبدیلی کا کام بغیر اس کے بھی انجام پا سکتا تھا کہ عربی حروف ملک سے جلا وطن نہ کر دیے جاتے اور عربی کتابوں کی طباعت کو جرم نہ قرار دیا جاتا۔

القانون المسعودی کی اس جدول کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضرورتی ہے کہ معاملے کا یہ پہلو سامنے آجائے کہ البیرونی سے پہلے عربی میں فن جغرافیہ اور علم ہیئت کی وہ شاخ جسے آج کل "اسفیریک اسٹرانومی" اور "پریکٹیکل اسٹرانومی" کے ناموں سے پکارتے ہیں کس حد تک ترقی کر چکی تھی اور جو سرمایہ پچھلی قوموں کا عربوں کو ملا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟ قاضی

ابن الرشد (Averroes) نے اپنی کتاب مابعد الطبیعۃ (میٹافزکس) میں "پریکٹیکل اسٹرانومی" کو "فن صناعۃ الہیئۃ التجربیہ" سے تعبیر کیا ہے اور "اسفیریک اسٹرانومی" کو عرب حکماء "الہیئۃ الکروی" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے۔ یہاں ہم صرف سرسری اشاروں پر اکتفا کریں گے

عربی میں ہیئت کی پہلی کتاب

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عربوں نے منطق اور فلسفے کی طرح علم ہیئت اور جغرافیے میں بھی تمام تر اعتماد یونانی حکیموں کی مصنفات پر کیا تھا اور اس بارے میں ان کے علم کی اصلی پونجی بطلیموس (Ptolemy) کی کتاب المجسطی (Almagest) تھی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بے شبہ یہ صحیح ہے کہ المامون عباسی کے عہد میں جب بطلیموس کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا تو اسے عام طور پر مقبولیت حاصل ہو گئی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہیئت اور جغرافیے کا جو مذہب (اسکول) سب سے پہلے عربی میں ترجمہ کیا گیا اور عام طور پر رائج ہوا وہ یونانی مذہب نہ تھا، ہندوستان کا مذہب تھا اور بطلیموس کی کتاب کی مقبولیت کے بعد اگرچہ اس کا عام رواج نہیں رہا تاہم البیرونی کے عہد تک یعنی پانچویں صدی ہجری تک کافی تعداد ایسے علمائے ہیئت کی موجود رہی جنھوں نے اپنے مباحث اور عملیات میں اس سے برابر کام لیا۔ چنانچہ البیرونی کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ از سر نو اُس کی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرے اور ابتدائی عہد کے ترجموں میں جو غلطیاں رہ گئی ہیں اُن کی اصلاح ہو۔ دراصل بطلیموس کی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی سے عربوں میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ ہندی اور یونانی مذہبوں کو باہم دگر جمع کر کے دونوں کی خصوصیات سے فایدہ اٹھایا جائے اور دونوں کے نقایص جمع و تطبیق کے بعد دور کئے جائیں۔ چنانچہ تیسری اور چوتھی صدی میں متعدد کتابیں اس مقصد سے لکھی گئیں اور اسپین کے بعض حکماء تو عرصے تک اسی طریق نظر سے کام لیتے رہے۔

علم ہیئت کی سب سے پہلی کتاب جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئی وہ ہندوستان کے مشہور فلکی اور ریاضی داں براہم گپت کی کتاب "براہم سپھت سدھانت" تھی جسے اس نے ۶۲۸ء مسیحی میں راجہ دیا گھر موکھ کے لیے تصنیف کیا تھا۔ البیرونی اور جمال الدین القفطی کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۴ھ (۷۷۱ء) میں سندھ کا ایک وفد خلیفہ المنصور العباسی کے دربار میں آیا تھا۔ اس وفد میں ایک شخص علم ہیئت

لہ الہند صفحہ ۲۰۸، اور تاریخ الحکما جمال الدین القفطی مطبوعہ لپزک صفحہ ۲۷۰۔ القفطی نے سندھ کے وفد کے ورود کی تاریخ ۱۵۶ھ لکھی ہے۔ البیرونی نے ۱۵۴ھ لکھا ہے۔ (آزاد)

تذاكير
ديوان الآثار القديمة بالهند

ابو الكلام

العدد ٥٣

صفة المعمورة على البيروني

التقطها

ا. زكى وليدى توغان

من «القانون المسعودي» لابى الريحان محمد بن احمد الخوارزمى البيرونى و ثلاثة كتب أُخرىٰ له: «تحديد نهايات الأماكن لتصحيح مسافات المساكن»، و «الجماهر في معرفة الجواهر»، و «الصيدنة»

PERSONAL LIBRARY
OF
ABUL KALAM AZAD
No.........................

ناظم الاشاعة، دهلي

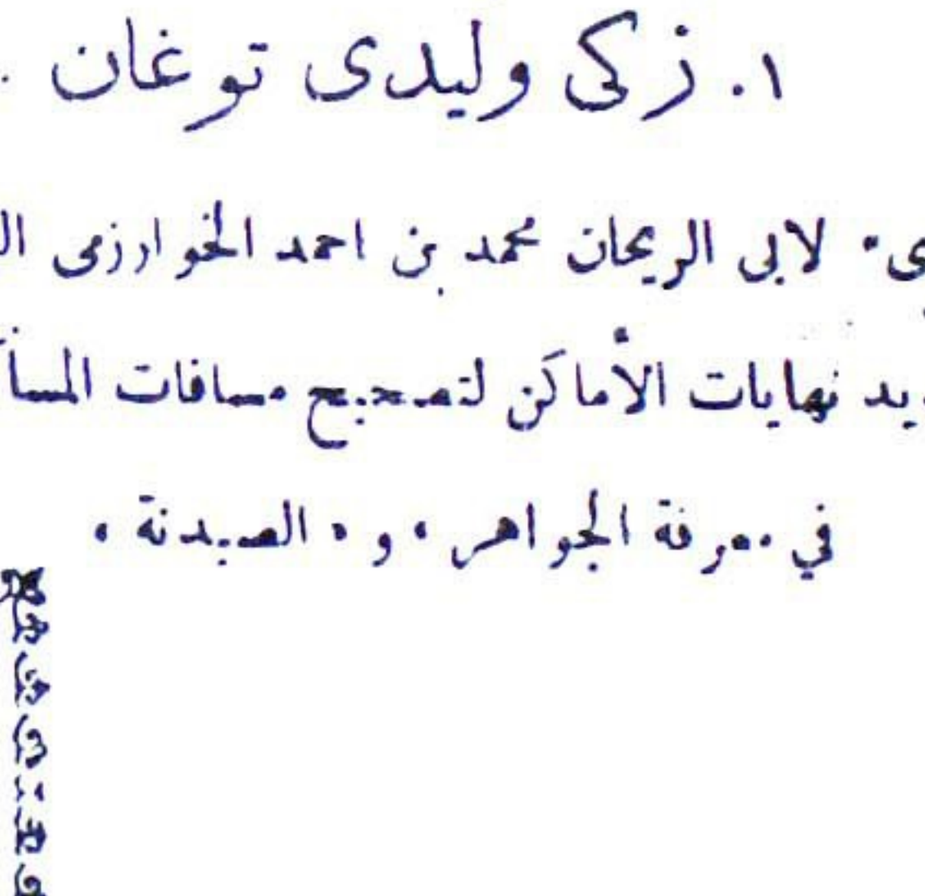

Marfat.com

کا بھی ماہر تھا۔ خلیفہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے اُس شخص کی خاص طور پر قدردانی کی اور حکم دیا کہ اس کی اعانت سے علمائے دربار عربی میں علم ہیئت کی ایک کتاب مرتب کریں۔ چنانچہ ابراہیم بن الحبیب الفزاری نے یہ کام انجام دیا اور عربی کا پہلا زیچ مرتب ہوا۔ البیرونی اور القفطی دونوں اس بیان میں متفق ہیں کہ الفزاری کی اس کتاب نے جو فی الحقیقت براہم گپت کی کتاب سدھانت کا ترجمہ تھا عربی علم ہیئت کا سب سے پہلا مدرسہ مہیا کیا۔ اس کے بعد المامون کا زمانہ آیا۔ اس عہد میں بطلیموس کی کتاب مجسٹک ترجمہ کی گئی۔ بطلیموس کا طریق بحث و نظر چونکہ نسبتاً زیادہ منضبط اور اور منظم تھا اس لیے علمائے عرب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی اور ہندوستانی علم ہیئت کی جگہ یونانی علم ہیئت زیادہ قبولیت حاصل کرنے لگا۔

یہی الفزاری کی کتاب ہے جو عربی میں "سند ہند" کے نام سے مشہور ہوئی "سندھانت" کے معنے سنسکرت میں علم و معرفت کے ہیں۔ نیز اس کا اطلاق علم و فن کے کسی خاص مذہب اور اصول پر بھی ہوتا ہے۔ پس "براہم سپھت سندھانت" کے معنے ہوئے علم ہیئت کا وہ مذہب جو براہم گپت کی طرف منسوب ہے۔ عربوں نے نام کا بقیہ جزء حذف کر دیا اور پھر "سدھانت" کو جس کی مخلوط دال ان کی زبان کے لیے بہت ثقیل تھی، "سند ہند" بنا لیا۔

البیرونی پر اس لفظ کی اصلیت مشتبہ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال "سدھانت" کی طرف نہیں گیا بلکہ ایک دوسرے سنسکرت مادہ "سدھاند" کی طرف چلا گیا "سدھاند" کے معنے استقامت یعنی سیدھے ہونے کے ہیں اور اسی سے پراکرت زبانوں میں "سیدھ" اور "سیدھے" کا لفظ بنا ہے۔ چنانچہ کتاب الہند میں وہ لکھتا ہے کہ عربوں میں "سند ہند" کے نام سے جو مذہب مشہور ہوا وہ دراصل "سدھاند" ہے یعنی ایسی بات جس میں کسی طرح کی کجی نہ ہو (صفحہ ۳)۔ المسعودی جو سنسکرت سے ناواقف تھا اس سے بھی زیادہ سخت غلطی میں پڑ گیا۔ اس نے "براہم گپت" کے "براہم" کو "برہما" سمجھ لیا اور خیال کیا کہ چونکہ ہندو تمام علوم و فنون کی اصل کو دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں اس لیے یہ علم بھی "برہما" کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔ وہ اس کتاب کا صحیح زمانۂ تصنیف بھی متعین نہ کر سکا۔[1]

۱۔ مروج الذہب، پیرس ایڈیشن، صفحہ ۱۴۸ (آزاد)

Marfat.com

ہندوستانی کلپ کا حساب

اجرام سماویہ کی حرکات کا ہندی حساب "کلپ" کا حساب تھا جو لاکھوں برس کا چکر کاٹتا ہے۔ اس کی بنیاد علمائے ہند کے اس خیال سے پڑی کہ تمام کواکب ایک ساتھ ملے جلے برج حمل یعنی نقطۂ اعتدال ربیعی میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر وہاں سے نکل کر اپنی اپنی حرکتوں کے چکر کاٹنے لگے۔ یہ چکر اس طرح چلتے رہتے ہیں کہ ہر ستارہ لاکھوں برس کا چکر کاٹ کر اپنے ابتدائی نقطۂ ربیعی میں واپس آتا ہے اور پھر وہاں سے نکل کر ایک نیا چکر کاٹنے لگتا ہے۔ یہ مدت جو ستاروں کے ایک چکر کاٹ کر واپس آنے کی ہے ایک "کلپ" قرار دی گئی ہے۔ برہم گپت کے حساب کے مطابق چار ارب بتیس[۳۲] کروڑ فلکی سال کا ایک "کلپ" ہوتا ہے۔ عربوں میں جب برہم گپت کی کتاب شایع ہوئی تو انھوں نے اس "کلپ" کے حساب کو سنین سند ہند کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ البیرونی کے زمانے تک "سنین سند ہند" علمائے فلکیات میں عام طور پر متعارف ہیں اور البیرونی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اصل سنسکرت کا ماخذ سامنے رکھ کر از سر نو اس حساب کی تنقیح و تصحیح کرے۔[۱]

ہندی یگ" اور "مہایگ"

"کلپ" کے طول و طویل حساب کو آسان کرنے کے لیے ایک طریقہ "یگ" اور "مہایگ" کا بھی اختیار کیا گیا تھا۔ ایک "یگ" کلپ کا ہزارواں جزو ہوتا ہے۔ یہ طریق حساب آریا بھٹ نے اپنی مصنفات میں اختیار کیا جس کا زمانہ تقریباً پانچویں صدی مسیحی کا زمانہ تسلیم کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں برہم گپت کی کتاب عربی میں ترجمہ ہوئی اسی زمانے میں آریا بھٹ کا حساب بھی عربی میں منتقل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس حساب کو عربوں نے "سنین ارجبھر" کے نام سے موسوم کیا۔ "ارجبھر" "آریا بھٹ" کا بگڑا ہوا عربی نام ہے۔

تبلتہ الارض

ہندوستان میں حرکات کواکب کے ادسات کا حساب دائرہ نصف النہار کی بنا پر کیا گیا تھا جو کرۂ ارضی کو آدھے آدھے ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ خط استوا، لنکا یعنی سیلون پر سے گذرا ہے اور وہ نقطہ جس میں خط استوا، خط نصف النہار کو کاٹتا ہے ٹھیک ٹھیک اسی جزیرہ پر واقع ہوا ہے۔ اسی لیے انھوں نے جغرافیے کے طول بلد کا حساب لنکا سے شروع کیا

۱۔ البیرونی، صفحہ ۲۳۰ (آزاد)

Marfat.com

تھا۔ یہ مقام جزائر خالدات کے مشرقی دائرہ نصف النہار سے ۹۰ درجہ پر واقع ہے جہاں سے بطلیموس نے اپنے اطوال کا حساب شروع کیا۔

ہندوستان کے علما ہیئت یہ بھی خیال کرتے تھے کہ مالوا کا مشہور شہر اوجین اُسی خطِ نصف النہار پر واقع ہے جو لنکا پر سے گزرا ہے۔ اور اسی لیے طول بلد کے حساب میں وہ اس شہر کا نام بھی اس طرح لے لیا کرتے تھے جس طرح لنکا کا لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں نے بھی اوجین کو اسی معنی میں اختیار کر لیا اور اُسے "اُزین" کہنے لگے۔ مثلاً وہ اپنے فلکی مباحث میں لکھتے ہیں کہ "رسندہند" کے مذہب کے مطابق طول بلد کا حساب "ازین" کے خط نصف النہار سے شروع ہوتا ہے یعنی اوجین سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لفظ "ازین" کو بعضوں نے "ارین" سمجھا اور بعض اہل لغت پر اس کی اصلیت مشتبہ ہو گئی۔

خط نصف النہار جس نقطہ پر زمین کو دو ٹکڑوں میں منقسم کرتا ہے اُسے عرب علماء ہیئت نے قبتہ الارض سے تعبیر کیا ہے یعنی زمین کا درمیانی گنبد۔ چونکہ اُوجین کی نسبت خیال کیا گیا تھا کہ "سدھانت" کے حساب کے مطابق طول بلد کا حساب یہیں سے شروع ہوتا ہے اس لیے اس عہد کی کتابوں میں ہمیں اس طرح کی تصریحات ملتی ہیں کہ "ازین" "رسند ہند" کے مطابق قبتہ الارض ہے۔ اس تعبیر نے بھی متاخرین کو جو اصلیت سے بے خبر تھے غلط فہمیوں میں ڈال دیا اور وہ دور دراز گوشوں میں نکل گئے۔

یہ خیال کہ "ارین" یا "اُرین" خط استوا کا وسطی نقطہ ہے عربی علم و ادب میں یہاں تک عام ہو گیا تھا کہ رفتہ رفتہ اس لفظ نے وسط کے معنی سے بڑھ کر اعتدال کے معنے پیدا کر لیے اور اُسے اشیاء و حالات کے اعتدال کے لئے بطور ایک اصطلاح کے استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ الشریف الجرجانی اپنی کتاب "التعریفات" میں "اُرین" کا لفظ بھی لایا ہے اور اس کے معنی محل اعتدال کے بیان کیے ہیں۔ پھر مزید تشریح کرتا ہوا لکھتا ہے "یہ زمین کا وہ نقطہ ہے جہاں دونوں قطبوں کا ارتفاع مساوی ہو جاتا ہے اور رات دن برابر کے ہونے لگتے ہیں، عرف میں مطلقاً محل اعتدال کے معنی میں مستعمل ہے"۔

بہرحال یونانی علم ہیئت کی اشاعت سے پہلے عربوں میں جو علم ہیئت مقبول ہوا تھا وہ ہندوستان کا علم ہیئت تھا اور کرۂ ارضی کے اطوال و عروض کا حساب "سدھانت" ہی کے طرز پر کیا جاتا تھا۔ پھر جب المامون کے عہد میں بطلیموس

Marfat.com

کی مجسطی کا ترجمہ ہوا تو یونانی مذہب کی عام مقبولیت شروع ہوگئی اور سدھانت کا مذہب خاص خاص حلقوں میں محدود ہوکر رہ گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بطلیموس کا حساب ہندوستان کے حساب سے کہیں زیادہ جچا تُلا اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ اس کی کتاب کے ترجمہ کی اشاعت کے بعد حکما عرب کی توجہ زیادہ تر اس کی طرف کھنچنے لگتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود المامون کے زمانہ میں بطلیموسی حساب مستند تسلیم کرلیا گیا ہے کہ جب اس کے حکم سے کرۂ ارضی کی پیمائش کا کام انجام دیا گیا تو اس غرض سے بطلیموسی حساب ہی کا ایک درجہ چُنا گیا تھا اور اُسی کی پیمائش سے کرہ کی مجموعی پیمائش نکالی گئی تھی۔

الہیتہ الکروی اور الہیتہ التجربی

تیسری صدی ہجری کا زمانہ عربی ریاضیات کی نشوونما کا اصلی زمانہ تھا۔ اسی عہد میں علم ہیئت کی یہ دونوں اہم شاخیں یعنی "الہیتہ الکروی" اور "الہیتہ التجربی" عربی میں نمایاں ہوئیں، لیکن ابھی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا۔ چنانچہ اُس عہد کے آثار میں ان کا فقدان ہمیں صاف صاف نظر آجاتا ہے۔

عربی زبان میں دنیا کا پہلا نقشہ غالباً المامون کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد متعدد سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے اپنی اپنی معلومات کے مطابق نقشے تیار کیے جن میں سے بعض دست بُرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں اور آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تمام نقشے نہایت سادہ اور ابتدائی درجے کے تھے۔ ان میں طول بلد اور عرض بلد کی تقسیم کی کوئی رعایت نہیں کی گئی تھی، صرف سات اقلیموں کی تقسیم پیش نظر رکھی گئی تھی اور بڑے بڑے شہروں کے نام ان کا تخمینی محل تجویز کر کے لکھ دیا گیا تھا۔ چنانچہ صور الاقالیم کے جو نقشے ہمیں اب ملے ہیں وہ تمام تر اسی طرز پر تیار کیے گئے ہیں۔ غالباً چوتھی صدی کے اوائل سے اُس طرح کے نقشے بننا شروع ہوئے جن کا نمونہ ہمیں الادریسی کے مشہور عالم نقشے میں ملتا ہے۔ اب نقشوں کی ترتیب کی نوعیت بدل گئی۔ خط نصف النہار اور خط استواء کی بنیادی تقسیم اور طول بلد اور کے درجوں کا انضباط اسی دقتِ نظر کے ساتھ کیا جانے لگا جس طرح آجکل کے نقشوں میں کیا جاتا ہے۔ البتہ سات اقلیموں کی تقسیم جسے قدیم ہندوستانی اور ایرانی تخیل نے عربوں کے لیے مہیا کر دیا تھا اب بھی قائم رہی اور خطِ استواء کے شمال میں ان کے خطوط دائرہ معمورہ کو سات حصّوں میں

Marfat.com

منقسم کرتے رہے۔ اسی عہد میں عربوں کا خاص علم جغرافیہ پوری طرح تکمیل کو پہنچا اور ان کی مجتہدانہ کوششوں نے قدماء کی کوتاہیوں کی درستگی کی۔ بطلیموس کو افریقہ اور ہندوستان کے بعض شہروں اور دریاؤں کا پورا علم نہیں ہوا تھا اور بہت سے شہر مغربی ایشیا میں نئے نئے آباد ہوئے تھے، مثلاً کوفہ۔ بغداد۔ بصرہ، شیراز وغیرہ، ان جدولوں میں اب ہمیں یہ تمام نام ملنے لگتے ہیں اور ان کا طول بلد اور عرض بلد بھی دقتِ نظر کے ساتھ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہندی حساب کی بنیادی غلطیاں

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان کے علمائے ہیئت کی نہ تو یہ تحقیق درست تھی کہ خط استوا، سیلون پر سے گزرا ہے اور نہ یہی خیال صحیح تھا کہ شہر اوجین بھی اسی خط پر واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آجکل ہر شخص جو کسی اسکول کا چھپا ہوا معمولی نقشہ حاصل کر کے ایک نظر دیکھ لے سکتا ہے یہ غلطی فوراً معلوم کر لے گا۔ البتہ یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ ہندوستان کے قدیم فن نے جس زمانے میں ان علوم کو مدوّن کیا تھا اس زمانے کے وسایل علم و تجارب نہایت درجہ محدود تھے اور رصد بندی اور مشاہدات کا صحیح سر و سامان تقریباً ناپید تھا۔ ایسی حالت میں اگر چند درجوں کا فرق وہ محسوس نہ کر سکے اور خطِ نصف النہار اور خط استوا کا صحیح محل تقاطع اُن پر مشتبہ ہو گیا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اُن کے علمی مقام کی عزت و شان پر کوئی دھبہ لگ سکتا ہے۔ ان کی اِن کوتاہیوں سے کہیں زیادہ ان کی علمی کامرانیاں ہیں۔

Marfat.com

البیرونی کا عہد اور عربی فن جغرافیہ و تخطیط

البیرونی کی نشوونما چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی اور اس کی پختہ عمر کی مصنفات پانچویں صدی میں انجام پائیں۔ اس لیے ہم اس کا عہد دونوں صدیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس زمانے تک عربی کا جغرافیہ اور کرۂ ارضی کی تخطیط کا فن جس درجے تک پہنچ چکا تھا اس کا اندازہ حسب ذیل سطور سے کیا جا سکے گا۔

(۱) علم ہیئت کی وہ اہم شاخیں جنھیں آجکل اسفیریک اسٹرانومی اور پریکٹیکل اسٹرانومی کے نام سے پکارا جاتا ہے، عربی زبان میں ابھر چکی تھیں لیکن ان کی عملیات ابھی عام نہیں ہوئی تھیں اور علمائے فن نے اُن سے زیادہ کام نہیں لیا تھا۔

(۲) جغرافیے کی کتابیں کثرت کے ساتھ لکھی گئی تھیں اور ان میں طول بلد اور عرض بلد کی تقسیمیں مجسطی کی تصریحات کے مطابق کر دی گئیں تھیں لیکن اس کی کوشش بہت کم کی گئی تھی کہ اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربی عملیات کے ذریعے اس فن کو از سر نو مرتب کیا جائے۔

(۳) جہاں تک جغرافہ کی عام معلومات کا تعلق ہے عرب، افریقہ، ایشیائے کوچک، مغربی ایشیا، روم اور اسپین کی جغرافیائی معلومات نہایت وسعت کے ساتھ فراہم ہو گئی تھیں۔ الہمدانی نے عرب کا جغرافیہ اس تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ آج بھی اس سے زیادہ نہیں لکھا جا سکتا۔ الاصطخری نے مغربی ایشیا کی تحقیقات بڑی دقت نظر کے ساتھ کی اور گو اس کی مفصل کتاب ابھی تک ناپید ہے مگر جتنا حصہ ہمارے ہاتھ آیا ہے اس سے ہم اس کی وسعت معلومات کا اندازہ لگا سکتے ہیں، تاہم جہاں تک وسطِ ایشیا، ہندوستان، چین اور جزایر غرب الہند کا تعلق ہے، عرب جغرافیہ نویسوں کی تحقیقات ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھیں اور تحقیق و نظر کے بہت سے گوشے باقی رہ گئے تھے۔

(۴) جغرافیے کی کتابوں میں ایک بڑا عنصر مختلف عہد کے سیاحوں کی روایتوں کا بھی شامل ہو گیا تھا۔ ان میں ہر طرح کا رطب و یابس مواد تھا۔ علمی نقطۂ خیال سے ان کی تنقیح و تحقیق کی بہت کم کوشش کی گئی تھی۔ تیسری صدی میں بحر ہند اور

Marfat.com

بحرچین کے جزیروں کی نسبت جو بے اصل اور وہم پرستانہ قصے بصرہ اور ہرمز کے بازاروں میں پھیل گئے تھے اور جن کی جھلک ہمیں الف لیلیٰ کی سندباد کی کہانیوں اور قزوینی کی عجائب المخلوقات میں دکھائی دیتی ہے، اس طرح کے بے شمار قصے اس عہد کی جغرافیے کی کتابوں میں بھی خلط ملط ہو گئے۔

(۵) سنسکرت سے جو علوم عربی میں ترجمہ کیے گئے وہ غلطیوں سے خالی نہ تھے اور ان کے متعدد مقامات تشریح کے محتاج تھے۔

جس طرح یونانی تراجم کی نظرثانی ابوالنصر فارابی نے کی اور جس طرح ابن الرشد نے ارسطو کے مقالات کی شرحیں لکھ کر ان کے مطالب واضح کیے اسی طرح ہندی علوم کی اصلاح و تہذیب کے لیے بھی ایک ابوالنصر اور ابن الرشد کی جگہ خالی رہ گئی تھی اور ابھی تک کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا تھا۔

البیرونی کا علمی کارنامہ

اس سلسلے میں البیرونی نے جو علمی کارنامے انجام دیے انھیں مختصراً حسب ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) البیرونی نے قدماء کے سرمائے پر از سرِ نو نظر ڈالی اور اُس کے نقایص دور کیے۔ اس نے فن جغرافیہ کی بنیاد اسفیریک اور پریکٹیکل اسٹرانومی کے عملی تجارب پر رکھی اور متعدد کتابیں اس موضوع پر تصنیف کیں۔

(۲) اس نے دنیا کی تمام معلوم آبادیوں کے طول و عرض کو بحث و تحقیق کے بعد از سرِ نو مرتب کیا اور قدماء کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ چنانچہ القانون کے علاوہ اس کی چار اور کتابیں اسی موضوع پر ہیں: تحدید نہایات الاماکن، تہذیب الاقوال فی تصحیح العروض والاطوال، تصحیف المنقول من العروض والطول، تصحیح الطول والعروض المساکن المعمورہ من الارض۔

(۳) وسط ایشیا اور ہندوستان کی جغرافیائی تحقیقات کا گوشہ ابھی تک تشنہ تھا۔ اُس نے اپنے ذاتی مشاہدہ و تحقیقات سے اس کی کمی پوری کی۔ ہندوستان کے بارے میں اس کی تحقیقات نہ صرف اُس عہد میں بلکہ آج بھی اپنی بے داغ نمایاں جگہ رکھتی ہے۔

(۴) اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تحقیقات کے ہر گوشہ میں وہ ایک خالص سائنٹفک معیار نظر سے ہر بات کو تولتا ہے اور کسی دوسرے غیر علمی عنصر کا اثر قبول کرنے سے قطعاً منکر ہے۔ اس نے ہر طرح کی وہم پرستیوں اور

Marfat.com

مذہبی زود اعتقادیوں کے خیالات سے جغرافیائی معلومات کو یک قلم پاک کر دیا، چنانچہ القانون المسعودی کے دیباچے میں اُس نے اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۵) ہر قوم کے علوم و فنون پر پیدائش و تکمیل کے متعدد دور گزرتے ہیں۔ پہلا دور پیدائش کا ہوتا ہے، دوسرا نشو و نما کا، تیسرا پختگی اور تنقیح کا۔ عربی علوم کی تاریخ میں چوتھی صدی کا خاتمہ اور پانچویں صدی کا آغاز تمام علوم عربیہ کی پختگی اور تنقیح کا زمانہ تھا۔ بغداد سے لے کر اسپین تک وقت کی عام علمی روح یہی تھی۔ اسلام کے تمام دینی علوم کی بھی اسی عہد میں تکمیل و تہذیب ہوئی۔ سامانی حکومت کے ایماء سے اسی عہد میں ابو النصر الفارابی نے یونانی فلسفہ سے تراجم کی ازسرِنو تصحیح و تہذیب کی۔ تقریباً اس عہد کے کچھ عرصے بعد اسپین میں ابن الرشد پیدا ہوا۔ اس نے ارسطو کی مصنفات کی شرحیں لکھیں اور ان کے مطالب میں جس قدر الجھاؤ پڑ گئے تھے انھیں دور کیا۔ یہی عہد ہے جس میں ابو علی سینا یونانی طب کو منقح و مہذب کر کے ازمنۂ وسطیٰ کی درس و تدریس کے لیے اپنی کتاب القانون مہیا کر دیتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو البیرونی کی شخصیت میں اس کے عہد کی یہ علمی روح پوری طرح نمایاں ہوئی تھی اور وہ بجا طور پر الفارابی اور ابن الرشد کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ جس طرح ان دونوں نے یونانی فلسفے کے تراجم کی تصحیح کا کام انجام دیا تھا اسی طرح البیرونی نے علم ہیئت اور جغرافیے کی ازسرِنو تصحیح و تہذیب کی اور ہندوستانی علوم کو نئے سرے سے عربی میں مدوّن کیا۔

(۶) لیکن البیرونی اس صف میں نمایاں ہونے کے ساتھ اپنی ایک خاص بلند تر جگہ بھی رکھتا ہے۔ ابو النصر فارابی اور ابن الرشد دونوں اس زبان سے ناواقف تھے جس زبان کے فلسفے کی تصحیح و تہذیب میں مشغول ہوئے تھے۔ انھوں نے تمام تر اعتماد عربی کے قدیم تراجم پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصحیح مکمل تصحیح نہ ہو سکی اور بعض غلط فہمیاں جو عہد تراجم کے ابتدائی دور میں پیدا ہو گئی تھیں آخر تک دور نہ ہو سکیں۔ مثلاً ابو النصر فارابی نے الجمع بین الرائین میں ارسطو کی طرف ایک ایسا بیان منسوب کر دیا ہے جو فی الحقیقت اسکندریہ کے مذہب افلاطون جدید کے بانی پلاٹینس کا تھا۔ خود مذہب افلاطونِ جدید کے بارے میں عربوں کی یہ غلط فہمی برابر قائم رہی کہ وہ اسے افلاطون کا مذہب تصور کرتے رہے۔ الفارابی نے ارسطو اور افلاطون کے مذاہب میں تطبیق دینے کی جو کوشش کی وہ دراصل اپنی بنیاد ہی میں غلط تھی اور اسی غلط فہمی پر مبنی تھی۔

Marfat.com

لیکن البیرونی نے نظر و تحقیق کی بالکل دوسری راہ اختیار کی۔ اُس نے جن علوم کو اپنا موضوعِ نظر قرار دیا انھیں خود ان کی اصلی زبانوں میں پڑھنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے علوم کی اس نے جس قدر تحقیقات کی سنسکرت کی تحصیل کے بعد کی۔ فارسی، خوارزمی اور جرجانی زبانیں اُس کے لیے بمنزلۂ مادری زبانوں کے تھیں۔ اس لیے قدیم ایرانی تاریخ و سنین کی تحقیقات میں اسے کسی درمیانی وسیلہ کا منت پذیر نہیں ہونا پڑا۔ جہاں تک یونانی اور سُریانی زبانوں کا تعلق ہے گو کوئی براہِ راست تصریح ہمیں نہیں ملی ہے، لیکن الآثار الباقیہ میں اس نے اپنی تحقیقات کا جس پیرائے میں ذکر کیا ہے اُس سے متر شح ہوتا ہے کہ غالباً وہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف نہ تھا۔ عبرانی زبان سے اس کی ذاتی واقفیت کی تصریح خود اُس کے قلم سے نکلی ہوئی ہمیں مل گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص سنسکرت، یونانی، سُریانی، فارسی اور عبرانی زبانوں سے براہِ راست واقفیت رکھتا ہو اس کی علمی حیثیت کے مقابلے میں الفارابی، بوعلی سینا اور ابن الرشد وغیرہم کو لانا کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان اکابر کا علمی پایہ کتنا ہی بلند ہو تاہم ان کا تمام علمی سرمایہ عربی مترجموں کے رحم پر تھا۔ وہ براہ راست نظر و تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی کی پوری علمی تاریخ میں البیرونی کا مقام یک قلم منفرد نظر آتا ہے۔

الآثار الباقیہ میں ایران کی قدیم تاریخ پر بحث کرتے ہوئے وہ جن واقعات کا ذکر کرتا ہے ان کی اطلاع اُسے صرف یونانی زبان کے ماخذوں ہی کے ذریعے مل سکتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا کہ ایرانی بادشاہوں کی وہ داستان جو "سیر ملوک الفرس" کے نام سے عہد عباسی میں ترجمہ کی گئی اور جسے البیرونی کا ایک معاصر فردوسی اپنی غیر فانی نظم کا جامہ پہنا رہا تھا، دراصل ایران کی تاریخ نہیں تھی۔ اس کا قومی افسانہ تھا۔ تاریخ کے لیے اُسے دوسرے ماخذوں کی طرف دیکھنا چاہیے چنانچہ وہ پارس اور ماوہ کے ہخامنش خاندان کے واقعات سے بے خبر نہ تھا اور گورش اعظم سے جسے یونانیوں نے سائرس اور یہودیوں نے خورس کے نام سے پکارا، پوری طرح واقف تھا۔ حالانکہ عربی کے عام مورخ جنھوں نے اس سے پہلے ایران کی تاریخیں لکھیں، اس حقیقت حال سے بے خبر تھے۔ ظاہر ہے کہ اسے ہخامنش خاندان کے بادشاہوں کے حالات یونانی ماخذوں سے معلوم ہوئے ہوں گے کیونکہ ایران کی تاریخی داستانوں میں ہمیں ان کا

Marfat.com

کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البیرونی نے الآثار الباقیہ میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے ناموں کی دو جدولیں بنائی ہیں، ایک کو وہ رومی جدول سے تعبیر کرتا ہے یعنی یونانی جدول سے، دوسری کو فارسی جدول قرار دیتا ہے۔ رومی جدول میں ان تمام بادشاہوں کے نام درج کیے ہیں جن کا سلسلہ گورش اعظم سے شروع ہوتا ہے اور دارایوش سوم پر ختم ہوتا ہے اور جو دراصل ایران قدیم کی واقعی تاریخ ہے۔ فارسی جدول ایران کے قومی افسانہ پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ تمام نام ہمیں ملتے ہیں جو شاہنامے کے افسانوی نام ہیں۔

وہ بودھ مذہب کی قدیم تاریخ سے بھی بے خبر نہ تھا۔ وہ اُس عہد کے تمام عرب مورخوں کی طرح اسے "سمنی" مذہب کے نام سے موسوم کرتا ہے جو سنسکرت کے لفظ "شمن" کی تعریب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے بودھ مذہب افغانستان میں پھیلتا ہوا ہندوکش کی دیواروں کو بھی عبور کر گیا تھا اور بامیان اور بلخ میں "سمنی" بھکشوؤں کی بڑی بڑی خانقاہیں آباد ہو گئی تھیں۔

ہفت اقلیم

دنیا کے آباد حصہ کو سات ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا تخیل ہندوستان اور ایران دونوں جگہ پیدا ہوا۔ گویا انڈو آرین قبائل کے تخیل نے اور بہت سی باتوں کی طرح اس بارے میں بھی ایک ہی رُخ اختیار کیا تھا، لیکن یونانیوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کرۂ کے معمور حصہ کو تین برّاعظموں میں تقسیم کر دیا: یورپ، ایشیا اور افریقہ۔ چونکہ عربوں نے جغرافیہ میں زیادہ تر اعتماد بطلیموس پر کیا تھا، اس لیے قیاس چاہتا تھا کہ وہ یونانی تقسیم کے مطابق اپنے نقشوں کو مرتب کرتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ غالباً یہ دیکھ کر کہ ہندوستان اور ایران دونوں نے سات اقلیموں کی تقسیم اختیار کی ہے، انھوں نے بھی یہی تقسیم اختیار کر لی اور ہندوستان اور ایران کے "ہفت کشور" کی طرح عربوں میں بھی "اقالیم السبعہ" کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ البیرونی نے "تحدید نہایات الاماکن" میں اس موضوع پر بہ تفصیل بحث کی ہے اور اس کی یہ فصل قابل ذکر معلومات پر مشتمل ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"قدیم ایرانی بادشاہوں کا مستقر "ایرانشہر" تھا یعنی عراق، فارسُ الجبال اور خراسان۔ انھوں نے ان ممالک کو دنیا کے آباد حصہ کے وسط میں بہ منزلۂ واسطہ العقد" یعنی درمیانی کڑی کے قرار دیا تھا اور باقی ممالک کو چھ دایرے بنا کر اس کے چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ ان سات دایروں میں سے ہر دایرہ کو وہ "کشور" کہہ کر پکارتے تھے "کشور" کے معنی قدیم فارسی میں خط کے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ یہ دایرے اس طرح ایک دوسرے سے ممتاز واقع ہوئے ہیں جس طرح خطوط باہم دگر ممتاز ہوتے ہیں۔ انھوں نے ان سات حصوں کی تقسیم سات الگ الگ دایروں کی شکل میں کی تھی اور ان کی مجموعی صورت اس طرح کی بنتی ہے۔

Marfat.com

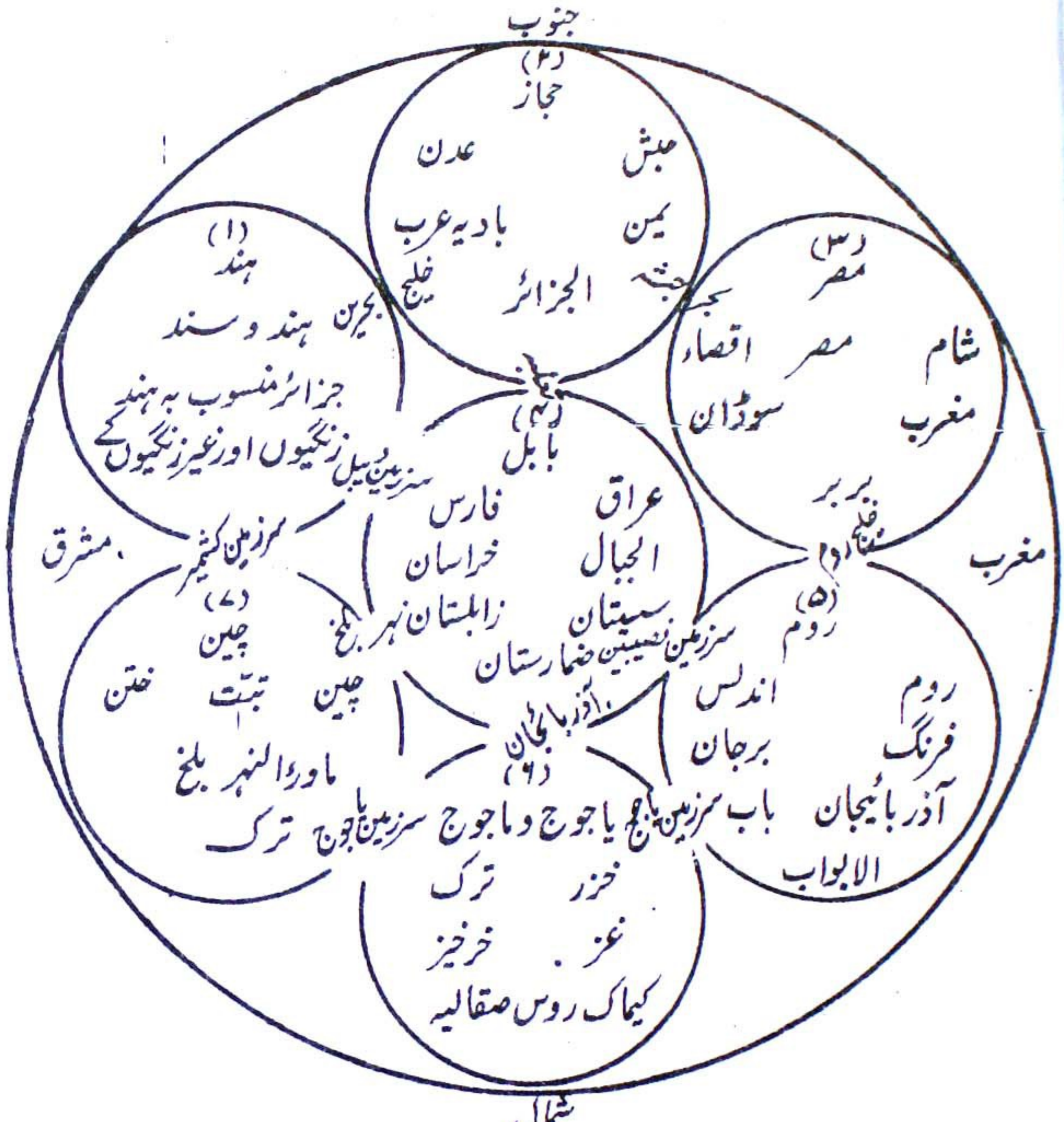

حکمائے ہند نے خیال کیا تھا کہ کرہ کا آدھا حصہ سمندر ہے آدھا خشکی ہے اور پھر وہ اس نصف حصے کے سات حصے اس طرح کے کرتے تھے کہ چار حصے تو چار جہتوں کے ہو جاتے یعنی پچھم، پورب، اُترا اور دکھن کے اور دو حصے اس طرح بنائے جاتے کہ چاروں جہتوں میں سے ہر دو جہت کا درمیانی حصہ دو مستقل حصوں کی شکل میں نمایاں ہو جاتا اس طرح چھ حصے متشکل ہوتے۔ پھر ان چھ حصوں کے درمیان ایک درمیانی حصہ بنایا جاتا اور اس طرح اصلاً تقریباً وہی تقسیم عمل میں آجاتی جو ایرانی تخیل کے ان دایروں میں کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل عربی جغرافیہ میں ہفت اقلیم کا تخیل پہلے ہندوستان ہی سے آیا ہوگا۔ پھر ایرانی تخیل کی اشاعت نے اسے مزید سہارا دے دیا۔

آج کل کرۂ ارضی کی شکل اس طرح کھینچی جاتی ہے کہ شمال اوپر ہوتا ہے جنوب نیچے اور مغرب بائیں جانب لیکن قدیم نقشوں میں اس سے الٹی جہات قائم کی جاتی تھیں یعنی شمال کی جگہ جنوب کی جہت اُوپر رکھی جاتی تھی، چنانچہ ان دایروں کو ترتیب دیتے ہوئے بھی جنوب کی جہت اُوپر رکھی گئی ہے، اس لیے ملکوں کی جو جہتیں ہمارے دماغوں میں بسی ہوئی ہیں اُن سے بالکل الٹی جگھوں میں وہ مقامات دکھائی دیتے ہیں

یہ ظاہر ہے کہ کرہ کی یہ تقسیم محض ایک وہمی تقسیم تھی جسے کسی علمی اصل سے دور کا بھی سروکار نہ تھا۔ محض یہ بات نمایاں کرنے کے لیے کہ پارس کی مملکت معمورہ کی وسطی اور مرکزی مملکت ہے اور باقی تمام دنیا اُسی کے چاروں طرف پھیلی ہے، یہ سات دایرے سات کشوروں کے نام بنائے جاتے تھے اور ہخامنش شہنشاہوں کے لیے مالک ہفت کشور کا لقب ڈھال لیا گیا تھا۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر سات اقلیموں کی تقسیم نے ایک علمی تقسیم کی شکل اختیار کر لی، چنانچہ عربوں کی جغرافیائی نقش آرائی میں یہ تقسیم اسی علمی تقسیم کی بنا پر نمایاں ہوتی ہے۔ اس تقسیم کی علمی بنیاد میں دو اختلافوں نے کام دیا تھا۔ سورج کے طلوع و غروب کے اوقات کا اختلاف اور موسم کا اختلاف۔ تقسیم خطِ استوا سے شروع ہوتی تھی اور قطب شمالی کی طرف بڑھتی ہوئی ختم ہو جاتی تھی۔ حساب کی اصل جو اس بارے میں کام کرتی تھی دن اور رات کے اوقات کا اختلاف تھا کیونکہ انسانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ محسوس اور موثر اختلاف یہی اختلاف حال ہے۔ قدما نے پہلے یہ بات معلوم کی کہ جو خطّہ سب سے زیادہ معتدل واقع ہوا ہے اس کے شب و روز کے گھنٹوں کی تعداد کیا ہوتی ہے۔ انھیں معلوم ہوا کہ ایسا خطّہ اس خطّ پر واقع ہوا ہے جہاں سب سے زیادہ لمبا دن ساڑھے چودہ گھنٹے کا ہوتا ہے، پھر انھوں نے دیکھا کہ خطِّ معتدل سے جو مقام باہر نکل گیا ہے وہ یا تو زیادہ ٹھنڈا ہے یا زیادہ گرم، زیادہ ٹھنڈا حصہ اس موضع سے ماورا ہے جہاں سب سے زیادہ لمبا دن سولہ گھنٹہ کا ہوتا ہے اور زیادہ گرم حصہ اس موضع سے ماورا ہے جہاں سب سے لمبا دن تیرہ گھنٹہ کا ہوتا ہے، پس انھوں نے سات اقلیموں کی تقسیم کے لیے معتدل حصّہ کو بطور مرکز کے قرار دیا اور چوتھی اقلیم ان میں بطور درمیانی واسطہ کے بن گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر دو اقلیموں کے وسطی مقامات میں آدھ گھنٹہ کا فرق پڑ گیا اور اس طرح تمام اقلیمیں آدھ آدھ گھنٹے کے اختلافِ اوقات سے ترتیب میں آ گئیں۔ جب ان کے اوساط میں وقت کا یہ

Marfat.com

اختلاف رونما ہوا تو لازمی طور پر ان کے اوایل میں بھی فرق پڑا اور اوایل اور اوساط کا باہمی اختلاف پاؤ پاؤ گھنٹہ کا حساب میں آیا۔

اب اقلیموں کی تقسیم کا بنیادی حساب یہ بن گیا کہ پہلے کرۂ ارضی کے معتدل ترین خطے کا تعین کیا جائے، پھر دیکھا جائے کہ ایسے مقامات کون سے ہیں جہاں طلوع و غروب کا اختلاف آدھ گھنٹہ تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر ان مقامات کو اقلیموں کا درمیانی محل قرار دے کر ان کے اوایل خطوط کو جہاں پاؤ گھنٹہ کا فرق ہونا چاہیے متعین کر لیا جائے۔

حساب کی صحت کے لیے ضروری تھا کہ دقایق اور ثوانی کے دقیق اختلافات پوری دقت نظر کے ساتھ ضبط میں آئیں اور اس کی نگرانی کی جائے کہ ان کی وجہ سے حساب میں خفیف سے خفیف فرق بھی نہ رہ جائے۔

البیرونی کے عہد تک جتنی جدولیں اقلیموں کی تیار کی گئی تھیں اُن میں طرح طرح کے باہمی اختلافات سرایت کر گئے تھے اور یہ اختلافات کئی راہوں سے آئے تھے۔

(۱) اقلیموں کے عروض کے تعین میں مشاہدہ و حساب کی غلطیاں رہ گئی تھیں، خصوصاً جیوب اور امیال (Tangents) کو مسطح کرنے اور ان کی مساحتی نوعیت کو پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ ضبط کرنے میں جو آسان کام نہ تھا۔ علاوہ بریں کرہ کی تسطیح جسے انگریزی میں (Orthographic Projection) کہتے ہیں بجائے خود حساب کا ایک نہایت نازک معاملہ ہے اور اس کے اعمال میں اگر خفیف سی غلطی بھی رہ جائے تو حساب کا تمام انضباط مختل ہو جاتا ہے۔ البیرونی سے پہلے کرہ کی تسطیح کے اعمال پوری طرح منقح نہیں ہوئے تھے۔ مختلف حالتوں اور وقتوں کے مشاہدات کے نقایص نے مختلف نتائج پیدا کیے اور ان کے اختلافات برابر بڑھتے گئے۔

(۲) کرے کی تخطیط کے لیے اس کے دور کو تین سو ساٹھ عروضی خطوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر خط ایک درجہ کہلاتا ہے، ہر درجے میں اوقات طلوع و غروب کا فرق آٹھ منٹ کا واقع ہوتا ہے جو پورے دور میں پہنچ کر چوبیس ۲۴ گھنٹے کا ہو جاتا ہے۔ یہی چوبیس گھنٹہ زمین کی حرکت دوری کا ایک مکمل چکر ہے۔ پیمایش کا طریقہ جو اختیار کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے دقیقہ سنجی کے ساتھ ایک درجۂ عروضی کی مسافت معلوم کر لی جائے۔ پھر اسے پورے اجزائے مسافت میں ضرب دیا جائے اور اسی طرح

Marfat.com

مجموعی مسافت کی صحیح مقدار نکال لی جائے۔

جس طرح حساب کی سہولت کے لیے کرۂ ارضی کے عرض کو تین سو ساٹھ ۳۶۰ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے اسی طرح طول کو ایک سو اسی ۱۸۰ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں نوے ۹۰ درجے شمالی حصے کے ہیں اور نوے ۹۰ جنوبی حصے کے اور درجوں کے ان خطوط کے تقاطع سے حدبندیوں کے خانے متشکل ہو گئے ہیں۔ پس ایک جزو کی پیمایش اور اس کا حاصل ضرب دو اقلیموں کے اطوال کی مجموعی مسافت تک ہمیں پہنچا دیتا ہے۔

لیکن قدماء کے استخراج و حساب میں کئی وجوہ سے نقایص پیدا ہو گئے تھے اور ان کی وجہ سے نتائج میں طرح طرح کے اختلافات پڑ گئے۔ سب سے بڑا بل کرہ کی شکل کی نوعیت سے پڑا۔ کرۂ ارضی کی شکل مستدیر ہے اور دونوں قطبوں کی سطح کسی قدر دبی ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اطوال کے درجے وسعت و تنگی کے اعتبار سے ایک مقدار کے نہیں ہو سکتے۔ تنوع اور تباین ناگزیر ہوا، ہم خطِ استواء سے شمال اور جنوب کی طرف جتنے بڑھتے جائیں گے اتنا ہی یہ فرق بھی بڑھتا جائے گا، چنانچہ موجودہ زمانہ کی پیمایش سے یہ بات متحقق ہو گئی ہے کہ اس اختلافِ حال کی وجہ سے دایرۂ نصف النہار کے درجوں کی مسافت میں سینکڑوں ہزاروں فٹ کا فرق واقع ہو گیا ہے۔ جو مسافت عرض البلد کے درجۂ صفر (یعنی خطِ استواء) پر تین لاکھ باسٹھ ہزار سات سو چھیالیس فٹ ہوتی ہے، وہ پینتالیس ۴۵ کے عرض البلد پر تین لاکھ چونسٹھ ہزار چھ سو پانچ ہو گئی ہے اور پھر چالیس ۴۰ عرض البلد یعنی قطب کے اطراف میں تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار چار سو اکھتر ہو جاتی ہے، گویا بہ تدریج کچھ کم چار ہزار فٹ کا فرق واقع ہو گیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ جب تک کرہ کی یہ نوعیت ملحوظ رکھتے ہوئے ہر درجہ کا حقیقی فرق پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ ضبط میں نہ لایا جائے صحیح تعداد مسافت متعین نہیں کی جا سکتی۔ قدماء کے حسابات میں چونکہ اس اختلافِ حال کی نوعیت ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی اس لیے لازمی طور پر مختلف مقامات کی عملیات نے مختلف نتائج پیدا کیے، اور رصد و مشاہدہ کے نتایج میں بھی اختلافات رونما ہو گئے۔

(۳) ایک اور سبب اختلافات کا یہ بھی ہوا کہ عرب جغرافیہ نویسوں میں سے بعض نے بطلیموس کی طرح جزائر خالدات سے پیمایش کی ابتداء کی تھی اور بعض نے بحر محیط سے کی تھی۔ چونکہ دونوں میں دس زمانوں کا فرق ہے اس لیے یہ فرق

Marfat.com

بھی پورے حساب میں سرایت کر گیا اور ایک جغرافیہ نویس کا حساب دوسرے جغرافیہ نویس کے حساب سے مطابقت نہ کر سکا۔

(۴) اس طرح کے رصدی حسابات میں دقیقوں اور ثانیوں کو صحت کے ساتھ معلوم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ نہایت دقیق آلات رصد کام میں لائے جائیں۔ البیرونی سے پہلے عرب حکماء ان آلات کی ایجاد میں کافی ترقی کر چکے تھے اور ابو محمود ابن الخضر الخجندی (المتوفی ۳۸۲ھ / ۹۹۲ء) نے آلہ "الفخری[1]" ایجاد کر کے ثوانی (سکینڈز) کے انضباط کا عمل بہت حد تک سہل کر دیا تھا تاہم ابھی تک رصدی اعمال میں اس سے پوری طرح کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس لیے حساب کے دقیق مراتب ضبط میں نہیں آئے تھے۔

(۵) اس کام کو صحت کے ساتھ انجام دینے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ مساحت کروی کی تسطیح کا یعنی مجسم اجرام کو مسطح شکل دینے اور کروی جسموں کو مستوی سطح میں بدل دینے کا طریقہ بالکل واضح ہو جائے لیکن البیرونی سے پہلے فن ریاضی کی یہ شاخ عربی میں پوری طرح رائج نہیں ہوئی تھی اور رصدی اعمال میں اس سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اُس نے خود الآثار الباقیہ میں تصریح کی ہے کہ "جہاں تک مجھے معلوم ہے مجھ سے پہلے کسی شخص نے اس موضوع پر خامہ فرسائی نہیں کی"۔

(۶) بطلیموس کے جغرافیہ کی تدوین کے بعد طرح طرح کے انقلابوں سے دنیا دوچار ہوئی۔ بہت سے پورانے شہر مٹ گئے اور ان کی جگہ نئے نئے شہر آباد ہو گئے۔ بعض دریاؤں کی دھاروں نے اپنی قدیم راہیں بدل دیں اور نئی نئی راہوں پر چلنے لگے۔ اسلام کے ظہور کے بعد انقلاب حال نے ایک دوسرا ورق الٹا اور ایشیا اور افریقہ کی بہت سی آبادیاں کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ عراق میں قدیم ایرانی شہنشاہی کا دارالحکومت ویران ہو گیا اور بصرہ، کوفہ اور بغداد کے ناموں سے نئے شہر بس گئے۔ مصر میں "منفس" کی جگہ "فسطاط" نے لی اور ایران میں "استخر" کی جگہ "شیراز" نے سر اٹھایا، مراکش، اسپین، وسط ایشیا اور سندھ میں بھی نئی عربی نوآبادیاں نمایاں ہوئیں اور جغرافیہ کے نقشوں میں بے شمار نئے مقامات اور نئے نام پیدا ہو گئے۔ ان آبادیوں کے جغرافیائی محل کا تعین قدیم یونانی معلومات نہیں کر سکتی تھیں اور ضروری تھا کہ نئی تحقیقات کے ذریعہ ان کے اطوال و عروض متعین کیے جائیں۔

بلاشبہ البیرونی سے پہلے ان مقامات کی نسبت تحقیق شروع ہو چکی تھی لیکن

---

[1] الفخری وہی آلہ ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ پہنچا اور مختلف ناموں سے مشہور ہوا۔ آج کل بھی یہ استعمال میں آتا ہے اور (Sextant) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ (آزاد)

Marfat.com

وہ مکمل نہ تھی اور رصد و مشاہدہ کے اعمال میں طرح طرح کی خامیاں رہ گئی تھیں۔

البیرونی فن جغرافیہ کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں پہلا شخص ہے جس نے قدماء کے یہ تمام نقایص صحتِ نظر کے ساتھ معلوم کیے اور پھر صحتِ رصد و مشاہدہ کے ساتھ انھیں دور کر کے جغرافیے کو ٹھوس سائینٹفک بنیادوں پر جما دیا۔ اسے قدماء سے جو کچھ ملا تھا وہ شکوک و اختلافات سے آلودہ تھا اور تخمین و قیاس کی پابندیوں سے قدم قدم پر رکاوٹیں حایل ہو گئیں تھیں۔ اُس نے اپنے بعد کے زمانے کے لیے جو کچھ چھوڑا وہ نہ صرف اختلافات و شکوک کی آلودگیوں سے پاک ہو چکا تھا بلکہ تخمین و قیاسات کی پابندیوں سے بھی آزاد تھا۔ خالص عقلی نظر و استدلال اور بے میل رصد و مشاہدہ اس کی تمام جغرافیائی سرگرمیوں کا غیر متزلزل معیارِ عمل رہا اور یہی اُس کے علمی کارناموں کی اصلی خصوصیت ہے۔

چنانچہ خود البیرونی نے معاملہ کے اس پہلو کی طرف جا بجا اشارات کیے ہیں۔ القانون کے دسویں باب میں جہاں اطوال و عروض بلاد کی جدول درج کی ہے لکھتا ہے:

قد اثبت فی هذا الباب جداول تضمنت اطوال البلدان وعروضها بعد الاجتهاد فی تصحیحها بموجب اوضاع بعضها من بعض وما بینهما من المسافات لا بالنقل الساذج من الکتب فانها فیها مختلطة فاسدة۔

میں اس باب میں شہروں کے طول و عرض کی جدولیں درج کرتا ہوں جو میں نے تصحیح کی پوری جدوجہد کرنے کے بعد مرتب کی ہیں۔ ان شہروں کے باہمی علایق اور باہمد گر مسافتیں پیش نظر رکھ کر یہ کام انجام دیا گیا ہے۔ میں نے محض پچھلی کتابوں سے نقل کر دینے کا طریقہ اختیار نہیں کیا کیونکہ ان کتابوں میں یہ معاملہ غلطیوں سے خلط ملط ہو گیا ہے۔

اس کتاب کے دیباچہ میں ہمیں اس طرف زیادہ اشارات واضح طور پر ملتے ہیں۔ میں امپیریل لائبریری کلکتہ کے نسخے سے اس کا ایک حصہ یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ یہ نسخہ عرصہ تک میرے مطالعہ میں رہا ہے۔

لم اسلک فیه مسلک من تقدمنی من افاضل المجتهدین فی حملهم من طالع اعمالهم واستعمل زیجاتهم علی مطایا

مجھ سے پہلے جو فضلائے مجتہدین گذر چکے ہیں انہوں نے خود بھی تقلید کی راہ اختیار کی اور اپنے مطالعہ کرنے والوں کو بھی وہی

Marfat.com

الترديد الى قضايا التقليد، باقتصارهم
على الاوضاع الزيجية وتعميتهم حيرما
زاولوه من عمل وطيهم عنهم كيفية ما
اصلوه من اصل حتى احوجوا المتاخر عنهم
فى بعضها الى استئناف التعليل وفى بعضها
الى تكلف الانتقاد والتضليل اذ كان
خلد فيها كل سهو بدر منهم لسبب
انسلاخة عن الحجه وقلة اهتداء
ستعليها بعدهم الى المحجة وانما فعلت
اهو واجب على كل انسان ان يعمله فى
صناعته من تقبل اجتهاد من تقدمه
بالمنة وتصحيح خلل ان عثر عليه بلا
حشمة وخاصة فيما يمتنع ادراك صميم
الحقيقة فيه من مقادير الحركات و
تخليد ما يلوح له فيها، تذكرةً لمن تاخر
عنه بالزمان واتى بعده، وقرنت بكل عمل
فى كل باب من علله وذكرما توليت من
عمله ما يبعد به المتامل عن تقليدى
فيه ويفتتح له باب الاستصواب لما
اصبت فيه او الاصلاح لما زللت
عنه او سهوت فى حسابه لان البرهان
من القضية قائم مقام الروح من
الجسد، وبجملة النوعين يحصل العلم
بالاستيقان لاقتران الحجة به والتبيان
كما يقوم بمجموع النفس والبدن
شخص الانسان، كاملًا للعيان۔

راہ دکھلائی لیکن میں نے اس کتاب
میں ان کا طریقہ اختیار نہیں کیا کیوں کہ
انہوں نے محض زایچوں کے اوضاع پر
اپنی نظر و بحث کو محدود کر دیا تھا اور جن
عملیات اور اصول کو خود جمع کیا تھا اُن
کی حقیقت سے بے خبر رہے تھے۔ اس
صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ معاملے
میں طرح طرح کے الجھاؤ پڑ گئے اور بعد
کے آنے والوں کو حیرانیاں پیش آئیں۔
بعضوں نے نئی علتیں ڈھونڈیں۔ بعضوں نے
ردّ و انتقاد میں تکلف کیا مگر اس پر بھی معاملہ
صاف نہیں ہوا کیونکہ دلایل کھوئے گئے
تھے اور غلطیوں نے ہر جگہ گھر بنا لیا تھا۔

میں نے اس بارے میں وہی کیا جو
ہر انسان کو کرنا چاہیے۔ یعنی اپنے پیشروؤں
کی کوشش کا احسان مند ہوا لیکن ان کی
جن غلطیوں پر مطلع ہوا بلا تامل ان کی
درستگی بھی کر دی۔ خصوصاً حرکتوں کی مقدار
کے مباحث میں کہ اصل حقیقت کا اس میں
پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میں نے ہر معاملے میں عمل کے ساتھ
اس کی علتوں کو بھی شامل کیا ہے۔ میں نے
ذاتی طور پر جو اعمال انجام دیے ہیں
ان کی حقیقت حال بھی پوری طرح واضح
کر دی ہے تاکہ سوچنے اور سمجھنے والے
اس میں غور و خوض کر سکیں اور جہاں کہیں
غلطی رہ گئی ہو اس کی اصلاح کر سکیں
برہان کی جگہ قضیوں کے اندر ایسی ہوتی

Marfat.com

ہے جیسی روح کی جگہ جسم میں ہے اور دونوں کے مجموعے ہی سے علمِ یقینی حاصل ہو سکتا ہے۔

الآثار الباقیہ میں وہ اپنی اُس کتاب کا جو کروی جسموں کی تسطیح کے موضوع پر لکھی تھی ذکر کرتا ہے اور پھر کہتا ہے "جہاں تک مجھے معلوم ہے مجھ سے پہلے کس نے اس موضوع پر خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔" (صفحہ ۳۵۷)

البیرونی کے بعد جس قدر اہم رصدی اعمال انجام دیے گئے اُن کے لیے اس کی تحقیقات نے اصل و بنیاد کا کام دیا۔ چنانچہ اس عہد کے بعد دو رصد گاہیں خاص طور پر مشہور ہوئیں، مراغہ کی رصدگاہ جسے ہلاکو خاں کے حکم سے نصیر الدین طوسی نے ۶۵۷ھ/۱۲۸۵ء میں تعمیر کرایا تھا اور سمرقند کی رصدگاہ جو الغ بیگ کے حکم سے ۸۴۰ھ/۱۴۳۶ء یا اس کے قرب و جوار میں تعمیر ہوئی۔ پہلی رصدگاہ کے اعمال محقق طوسی کی زیر نگرانی انجام پائے اور دوسری میں الغ بیگ کے علاوہ علامہ علی بن محمد قوشجی کی عملی سرگرمیاں بھی شریکِ کار رہیں۔ ان دونوں رصد گاہوں کی جدولوں کی تیاری میں البیرونی کی جدولوں سے بطور اصل و بنیاد کے کام لیا گیا۔ مراغہ کی جداول زیچ ایل خانی کے نام سے مشہور ہوئیں اور سمرقند کی زیچ الغ بیگ کے نام سے، متاخرین اہل فن کا اعتماد زیادہ تر انہی دو زیچوں پر رہا ہے۔ چنانچہ قزوینی اور مستوفی وغیرہما جہاں کہیں اطوال و عروض کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مقصود انہی زیچوں کی مقررہ مساحتیں ہوتی ہیں۔

Marfat.com

اقلیموں کی مساحت اور کرہ کی مجموعی مساحت

البیرونی نے اپنے اطوال کا حساب جزایر خالدات کی جگہ بحر محیط کے کنارہ سے کیا ہے اور عروض کا حساب حسب معمول خط استواء سے، ان جدولوں میں پہلی جدول سات اقلیموں کی تعداد، ساعات نہار اور جاڑے گرمی کے ارتفاعات و اظلال سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اقلیموں کے تعین کا دار و مدار اسی صورت حال کی تحقیق و تصحیح پر تھا۔ اس کے بعد دوسری جدول نمایاں ہوتی ہے جس میں اطوال و عروض کی تمام مساحتیں واضح کی گئی ہیں اور اس طرح پورے کرۂ ارضی کے دور عظیم کی مساحت کا مسئلہ طے کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے اور البیرونی کی جغرافیائی تحقیقات میں اپنی ایک خاص جگہ رکھتا ہے، اس لیے بے محل نہ ہوگا اگر اس بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جائے۔

البتہ یہ تفصیل ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھے گی کیونکہ پروفیسر۔ ای۔ وائڈمین (Wiedemann) اپنے مباحث میں جو القانون کے نوویل مقالہ کے سلسلہ میں انھوں نے لکھے تھے اس مسئلے پر بہ تفصیل بحث کر چکے ہیں اور جرنل ایشیاٹک میں بھی متعدد اہل قلم کے مقالات اس موضوع پر نکل چکے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

جہاں تک کرۂ ارضی کی مجموعی مساحت کے مسئلے کا تعلق ہے البیرونی سے پہلے جس قدر تحقیقات کی گئی تھیں وہ طرح طرح کی غلطیوں سے آلودہ ہوگئی تھیں۔ متقدمین میں مساحت کا ایک اندازہ حکماء ہند کا تھا، دوسرا یونان کا، تیسرا عربوں کا جو المامون کے مشہور عالم پیمائش سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ لیکن یہ تینوں اندازے یا تو اصلیت سے بہت زیادہ ہو گئے تھے یا بہت کم، حقیقت کے قریب کوئی نہیں پہنچ سکا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ جغرافیہ میں البیرونی پہلا شخص ہے جس کی تحقیقات اس درجہ جچی تلی اور محتاط ثابت ہوئیں کہ وہ قریب قریب اصلیت تک پہنچ گیا۔ آجکل ہر شخص جس نے جغرافیہ کی مبادیات کی تعلیم حاصل کی ہے جانتا ہے کہ کرۂ ارضی کے دور عظیم کی مساحت چوبیس ہزار آٹھ سو اٹھاون انگریزی میل ہے۔ البیرونی نے اپنی ان جداول میں جو مجموعی مساحت نکالی ہے وہ چوبیس ہزار سات سو نہتر میل ہوتی ہے یعنی البیرونی کی مقدار

Marfat.com

موجودہ زمانہ کی مسلمہ مقدار سے صرف نواسی میل کم ہوئی! جب البیرونی کے زمانے کے محدود وسائل تجارب و آلات کا مقابلہ موجودہ زمانے کے وسیع و عظیم وسائل علم سے کیا جاتا ہے تو بے اختیار اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اتنی بڑی اور پیچیدہ پیمائش میں صرف اتنی کمی کا رہ جانا البیرونی کے غیر معمولی فضل و کمال کا ایک تعجب انگیز علمی ثبوت ہے۔

ارسطو نے یونانی مہندسوں کی مساحت جو نقل کی ہے وہ چار لاکھ اسٹادیا ہے حکیم پسی ڈانیس (Paseidonius) نے ۱۵۰ قبل مسیح میں دو لاکھ چالیس ہزار اسٹادیا نکالا تھا۔ بطلیموس نے المجسطی میں کرہ کے ایک درجہ کی جو مساحت لکھی ہے اگر اس سے پورے دور کی مجموعی مساحت نکالی جائے تو وہ ایک لاکھ اسی ہزار اسٹادیا ہوتی ہے۔

قدیم یونانی اسٹادیا (Stadia) آجکل کے چھ سو فٹ نو انچ کے برابر ہوتا ہے۔ جب اس تناسب کو پیش نظر رکھ کر اسٹادیا کی مساحت انگریزی میلوں کی تعداد میں منتقل کی جاتی ہے تو ارسطو کی مساحت پینتالیس[1] ہزار نو سو چونسٹھ میل بنتی ہے۔ یعنی اصلیت سے تقریباً اکیس[2] ہزار ایک سو سات میل زیادہ، پسی ڈانیس کی مساحت ستائیس[3] ہزار پانچ سو اٹھتر میل ہوتی ہے یعنی اصلیت سے دو[4] ہزار سات سو اکیس میل زیادہ اور بطلیموس کے حساب کا نتیجہ بیس[5] ہزار آٹھ سو چوراسی میل نکلتا ہے یعنی اصلیت سے تین[6] ہزار نو سو تہتر میل کم۔

ہندوستان کے علمائے فلکیات میں سے حکیم پلھس اور برہم گپت کی مساحتیں البیرونی نے کتاب الہند میں نقل کی ہیں۔ وہ اس کتاب کی فصل اکیس میں جو ملکوں کے اطوال کے بارے میں ہے، لکھتا ہے۔ "برہم گپت کے نزدیک زمین کا دور چار ہزار آٹھ سو یوجن ہے اور قطر ایک ہزار پانچ سو اکاسی" (الہند صفحہ ۱۶۰) پھر فصل ۵۵ میں جہاں کواکب کے ابعاد پر بحث کی ہے یعقوب بن طارق کا قول نقل کیا ہے کہ اہل ہند کے نزدیک زمین کا قطر دو ہزار ایک سو فرسخ ہے اور دور چھ ہزار پانچ سو چھیانوے، پھر اس قول کو رد کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ حکمائے ہند کا متفقہ قول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پلھس کے نزدیک زمین کا قطر سولہ سو یوجن ہے اور دور پانچ ہزار چھبیس یوجن (الہند صفحہ ۲۳۳)۔ البیرونی نے اسی کتاب میں ہمیں بتلایا ہے کہ قدیم ہندی یوجن (योजन) بتیس[32] سو عربی ذراع کے مساوی ہوتا ہے (الہند صفحہ ۸۰، ۲۳۲) سینور کارلو نالینو (Carlo Nallino)

۱۔ پینتالیس ہزار پانچ سو گیارہ میل ہے۔ ۲۔ بیس ہزار چھ سو تریپن۔ ۳۔ ستائیس ہزار تین سو چھ۔ ۴۔ دو ہزار چار سو اڑتالیس۔ ۵۔ بیس ہزار چار سو اسی۔ ۶۔ چار ہزار تین سو اٹھتر

Marfat.com

اور محمود پاشا فلکی مصری نے اپنے مباحث میں یہ بات صاف کردی ہے کہ عربی میل جو چار ہزار ذراع کا ہوتا تھا تقریباً چھ ہزار چار سو تہتر انگریزی فٹ کے مساوی ہوتا ہے۔ جب اس تناسب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم ہندی یوجن کو انگریزی میلوں کی مقدار میں منتقل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حکیم برہم گپت کی مساحت پچاس ہزار نو سو چھتیس انگریزی میل کے برابر ہوتی ہے، یعنی اصلیت سے چھبیس ہزار اٹھتر میل زیادہ اور حکیم پلہس کی مساحت پچاس ہزار نو سو چونتیس بنتی ہے یعنی اصلیت سے چھبیس ہزار چھیتر میل زیادہ۔

ہندی حکماء کا ایک مذہب وہ بھی ہے جو آریا بھٹ کی طرف جسے عربوں نے ارجبھر کے نام سے یاد کیا ہے، منسوب ہے۔ یہ مندرجۂ صدر حکیموں سے پہلے گزرا ہے۔ اس کے نزدیک زمین کا دورِ عظیم تین ہزار تین سو چونسٹھ یوجن تھا۔ انگریزی میلوں کے حساب میں یہ مقدار تینتیس ہزار ایک سو ستتر ہوتی ہے یعنی اصلیت سے آٹھ ہزار تین سو انیس میل زیادہ۔

المامون عباسی کے حکم سے زمین کی پیمایش کا جو عمل دشتِ سنجار میں انجام پایا تھا اس کی بنا پر طے کیا گیا تھا کہ زمین کا دورِ عظیم پچیس ہزار گیارہ میل (انگریزی میل کے حساب سے) ہونا چاہیے۔ یہ مساحت بلا شبہ اصلیت سے قریب آ لگی تھی یعنی موجودہ زمانے کی مسلّمہ مساحت سے صرف ایک سو چون میل زیادہ تھی لیکن البیرونی نے معاملہ کو اور زیادہ اصلیت کے قریب کردیا۔ یعنی اس کی مساحت میں زیادتی کی جگہ صرف نواسی میلوں کی کمی رہ گئی جو اتنی بڑی مساحت میں چنداں قابل لحاظ نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ عہد کی مساحت سے پہلے اگر کوئی پیمایش صحت کے ساتھ عمل میں آئی تھی تو وہ البیرونی کی شخصی پیمایش تھی۔

Marfat.com

قبتہ الارض اور بعض قدیم مقامات

خطِ استوا اور قبتہ الارض

ہندوستان کے حکیموں میں یہ غلطی عام طور پر پھیل گئی کہ لنکا یعنی جزیرہ سیلون (سیلان عندالعرب) خطِ استواء پر واقع ہے اور نصف کرہ کا خط نصف النہار اسے قطع کرتا ہے نیز یہ کہ مالوا کا شہر اوجین بھی اسی خطّے پر واقع ہوا ہے۔ عربی میں چونکہ فلکیات کے مباحث پہلے پہل ہندی علم ہیئت کے دروازہ سے آئے تھے اور دوسری صدی ہجری میں موسیٰ بن محمد الخوارزمی نے برہم گپت کی سدّھانت (سند ہند عندالعرب) کے مطابق علم ہیئت کے مباحث ترتیب دیے تھے اس لیے یہ غلطی عربوں میں بھی پھیل گئی اور انھوں نے سیلون کو قبتہ الارض کے نام سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔ البیرونی نے اگرچہ سیلون کے قبتہ الارض ہونے میں شبہ ظاہر کیا ہے اور اس بارے میں جو توہمات ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے انھیں خرافات سے تعبیر کیا ہے تاہم حساب کی اصلی غلطی پر وہ بھی متنبہ نہ ہو سکا کیونکہ اس زمانے میں سیر و سیاحت کے وسایل اور رصدی اعمال کے طریقے اس درجہ محدود تھے کہ اس طرح کی غلطیوں کی درستگی بآسانی نہیں کی جا سکتی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو سیلون (سیلان) راجہ اشوک کے زمانہ میں اس درجہ مشہور و معلوم مقام تھا کہ اس نے اپنے بھائی اور بہن کو تبلیغ مذہب کے لیے وہاں بھیجا تھا اور وہاں سے آمد و رفت کے تعلقات برابر قایم رہے تھے، وہی سیلون چند صدیوں کے بعد ایک ایسا مجہول اور پُر اسرار مقام بن گیا کہ البیرونی کو بے حد جد و جہد کرنے پر بھی وہاں کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اس نے کتاب الہند باب ۳۰ میں سیلون کی نوعیت پر بہ تفصیل بحث کی ہے اور وہ تمام معلومات جمع کر دی ہیں جو کشمیر اور پنجاب کے پنڈتوں سے وہ فراہم کر سکا تھا۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں پُرانوں اور راماین کی کہانیاں اس طرح دماغوں پر چھا گئی تھیں کہ حقیقت کی پرچھائیں بھی کہیں پڑتی دکھائی نہیں دیتی۔

ہندوستان کے پنڈتوں کا اس وقت عام خیال یہی تھا کہ لنکا میں عفریت بستے

Marfat.com

ہیں اور انسان کا وہاں جاکر زندہ واپس آنا بہت دشوار ہے۔

البیرونی کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ عرب تاجروں اور سیاحوں کو اس وقت تک سیلون جانے اور وہاں کے حالات دیکھنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ ان کے جہاز بحر سیلون سے گزرتے رہتے تھے۔ وہ اسے سنگلدیپ کے نام سے پہچانتے تھے، اور بعض ساحلی مقامات سے اس کی خاص پیداوار بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن چونکہ وہاں اُترنے اور وہاں کے باشندوں سے رسم و راہ پیدا کرنے کی کوئی راہ نہیں نکلی تھی اس لیے ہندو افسانوں کا بڑا حصہ ان میں بھی پھیل گیا تھا اور وہ خیال کرتے تھے کہ ہندو افسانہ کا متوہمہ قلعہ لنکا کے کسی حصے میں موجود ہے۔ البیرونی نے عرب سیاحوں کی زبانی ایک اور پُراسرار جزیرہ کا حال نقل کیا ہے۔ جہاں سے وہ اپنے جہازوں پر لونگ (قرنفل) بار کیا کرتے تھے اور پھر لکھا ہے کہ عجب نہیں وہی جزیرۂ لنکا ہو پھر "لنکا" اور "لونگ" کی لفظی مشابہت سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ "لونگ" لنکا سے مشتق ہوا ہے حالانکہ "لونگ" کو لنکا سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کتاب الہند کے اسی باب میں ہندو افسانے کے متخیلہ قلعہ کا جس کی کوئی اصلیت نہ تھی ایک نقشہ بھی دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندو افسانوں میں لنکا اور سنگل دیب کو دو الگ الگ مقاموں کی شکل دی گئی تھی۔ چنانچہ یہ غلط فہمی البیرونی کی تحریرات میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ اُس نے القانون کی جدول میں لنکا اور سنگل دیب کے لیے دو مختلف درجے متعین کیے ہیں جو جدول خط استواء بلا عرض کے مقامات کی بنائی ہے، اُس میں لنکا کا طول بلد ۱۰۰ لکھا ہے۔ پھر ان مقامات کی جدول میں جو اقلیم اول اور خط استوا کے درمیان واقع ہیں، سنگل دیب اور سراندیپ کا ذکر کیا ہے اور اس کا طول بلد ۱۲۰ اور عرض بلد ۱۰ درجہ کا لکھا ہے۔ وہ لنکا کو مجہولات میں سے قرار دیتا ہے، مگر سنگل دیب کو مجہول نہیں کہتا۔ اسے بحر ہرکند کے جزایر میں شمار کرتا ہے۔ بہرحال وہ اس مقام کی صحیح تحقیق نہ کر سکا۔

بعض قدیم مقامات

ان جدولوں میں ہندوستان کے ان تمام شہروں، قلعوں اور دریاؤں کے مقامات کے اطوال و عروض منضبط کیے ہیں جن کا تذکرہ ہم کتاب الہند کے مختلف ابواب میں پڑھ چکے ہیں، خصوصاً باب ۱۸، ۲۴، ۲۵ اور ۲۹ میں، ان مقامات کے پرانے ناموں کو بعد کے ناموں سے تطبیق دینے کی جو کوششیں ایلیٹ، سخاؤ،

فیرنڈ، ابسٹریک اور مارکوارٹ وغیرہم نے کی تھیں وہ سب ڈاکٹر توگان کے پیش نظر تھیں اور اُن سے انھوں نے اپنے حواشی میں پورا فایدہ اٹھایا ہے۔ البتہ بعض مقامات ایسے تھے جن میں مزید غور و فکر (کی) گنجایش باقی رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر توگان نے ان کی تطبیق کی بھی کوشش کی ہے۔

البیرونی نے تھانہ (بمبئی) اور چیمور کو پہلی اقلیم میں درج کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ "لاران" کی سرحد پر واقع ہے۔ "لاران" کا ذکر "ابو الفداء" اور ابن خرداذبہ نے بھی کیا ہے اور مروج الذہب میں المسعودی نے اسے "لاردی" کی شکل دے دی ہے۔ اس نام کی اصلیت کے بارے میں لیسٹے وغیرہ کافی بحثیں کر چکے ہیں جن کے دُھرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ صاف بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "لاران" سے مقصود موجودہ گجرات کا علاقہ ہے۔

چیمور، چیول اور گنگا ساگر بھی پہلی اقلیم میں آتے ہیں "چیمور" اور "چیول" کے موجودہ مقامات ایلیٹ نے متعین کر دیے تھے۔

اسی اقلیم میں ۱۲۰ طول بلد پر "سنگل دیپ" کا ذکر کیا ہے اور ۱۵ عرض بلد پر جو سنگلدیپ کے عرض بلد سے پانچ درجے ہٹا ہوا ہے ایک دوسرے مقام کا نام آیا ہے۔ اور اسے سنگل دیپ کا "معبر" بتلایا ہے، "معبر" یعنی سنگلدیپ تک پہنچنے کا ساحلی مقام۔ لیکن یہ نام تمام نسخوں میں نقطوں کے نہ ہونے کی وجہ سے یک قلم مشتبہ ہو گیا ہے۔ یاقوت نے اسے "مندوقین" لکھا ہے اور قزوینی اسے "مندورقین" بتلاتا ہے۔ جی فیرنڈ (Ferrund) نے اس پر بحث کرتے ہوئے خیال کیا تھا کہ یہ غالباً "مندورٹین" ہوگا یعنی موجودہ زمانے کا مدورا۔ لیکن نقشہ میں مدورا کا جو محل ہے اسے دیکھتے ہوئے بات بنتی نہیں۔ البیرونی نے اپنی ایک دوسری کتاب الصیدنہ میں (جس کا خلاصہ اس مجموعہ میں شامل کر دیا گیا ہے) اس کا نام "مندری بین" لکھا ہے اور یہی نام جدول میں بھی ہے۔ غالباً یہی نام صحت سے قریب ہے اسے موجودہ زمانے کے نقشوں کا "منداپام" سمجھنا چاہیے یہ سیلون کے لیے معبر کا کام دے سکتا ہے۔

Marfat.com

البیرونی کے اطوال اور موجودہ اطوال کا باہمی فرق

یونانی جغرافیہ نویسوں کا جن میں بطلیموس خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے یہ خیال تھا کہ پچھم کی طرف خشکی کی انتہا بحر محیط یعنی اٹلانٹک کا مغربی ساحل ہے کیونکہ براعظم امریکہ کی موجودگی اس وقت تک غیر معلوم تھی۔ بحر محیط کے اس حصے میں وسطی افریقہ کے ساحل سے ٹکراتا ہے چند جزیرے واقع ہیں انھیں یونانیوں نے کینری (Canary) کے نام سے موسوم کیا تھا اور عرب انھیں "خالدات" اور "السعادہ" کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ جزیرے چونکہ شمالی افریقہ کے ساحل کے محاذ میں واقع ہوئے ہیں، اس لیے یونانیوں نے خیال کیا کہ خشکی کی آخری سرحد انہی جزیروں کو قرار دینا چاہیے چنانچہ انھوں نے انہی جزیروں کو اپنے حساب کے لیے نقطۂ صفر قرار دیا اور وہیں سے طول بلد کا حساب کرنے لگے۔ عرب جغرافیہ نویسوں نے بھی ابتدا میں یہی طریقہ اختیار کیا تھا لیکن پھر بعض ائمۂ فن نے خیال کیا کہ جزیروں کی جگہ شمالی افریقہ کے مغربی ساحل کو نقطۂ صفر قرار دینا زیادہ سہل اور واضح ہوگا۔ چنانچہ طول بلد کے حساب کا یہ دوسرا طریقہ بھی رائج ہوگیا اور جغرافیہ کے مباحث پر جو کتابیں لکھی جانے لگیں ان میں بغیر کسی امتیاز کے دونوں طریقے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بعضوں کا حساب جزیروں سے شروع ہوتا مگر وہ چونکہ پہلے طریقے کی مساحتوں کو بھی بلا امتیاز نقل کر دیتے مگر وہ دوسرے طریقے سے بھی تعرض نہ کرتے۔ بعضوں کا حساب ساحل بحر سے شروع ہوتا ہے مگر وہ چونکہ جزایر خالدات اور ساحل افریقہ میں دس زبانوں کا فرق ہے اس لیے یہ اختلاف اطوال کے پورے حساب میں سرایت کر گیا اور ایک ہی محل کے دو مختلف درجے کتابوں میں لکھے جانے لگے کسی حساب کا مدار جزایر کے مبدا پر تھا کسی کا ساحل کے مبدا پر اور تحقیق و امتیاز کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ البیرونی نے یہ بنیادی اختلاف محسوس کیا اور کوشش کی کہ اطوال کے حساب کے لیے صرف ایک ہی مبدا عمل اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ اس نے ساحل افریقہ کو مبدا قرار دے کر اپنا حساب مکمل کیا اور اسی کے مطابق تمام پرانے جغرافیہ نویسوں کے حساب کی تصحیح کی، نتیجہ یہ نکلا کہ اب دو طریقوں کی جگہ صرف ایک ہی معیاری طریقہ قایم ہوگیا اور اس بنیادی اختلاف حساب کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے وہ آئندہ کے لیے دور ہو گئے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے بعد جب یورپ میں علم و فن کا چرچا از سر نو شروع ہوا

Marfat.com

توجغرافیائی معلومات کے لیے انھوں نے عرب جغرافیہ نویسوں کی کتابوں پر
اعتماد کیا اور جہاز رانی کے لیے انہی کے بنائے ہوئے نقشے کام میں لانے لگے۔ اس عہد
میں الادریسی کا نقشہ جو اس نے راجر شاہ سسلی کی فرمایش سے طیار کیا تھا عام طور
پر مشہور ہوا اور جغرافیائی مباحث کے لیے بطور بنیادی سند کے کام دینے لگا۔
الادریسی نے اطوال وعروض کے لیے بطلیموس کا حساب اختیار کیا تھا اور بطلیموس
نے جزایر خالدات کو نقطۂ صفر قرار دیا تھا، اس لیے حساب کا یہی طریقہ یورپ میں
بھی رایج ہوگیا چنانچہ نشئۃ حدیثہ[۲] (Renaissance) کے عہد کے تمام نقشوں میں
اطوال وعروض کا یہی حساب ہمیں ملتا ہے۔

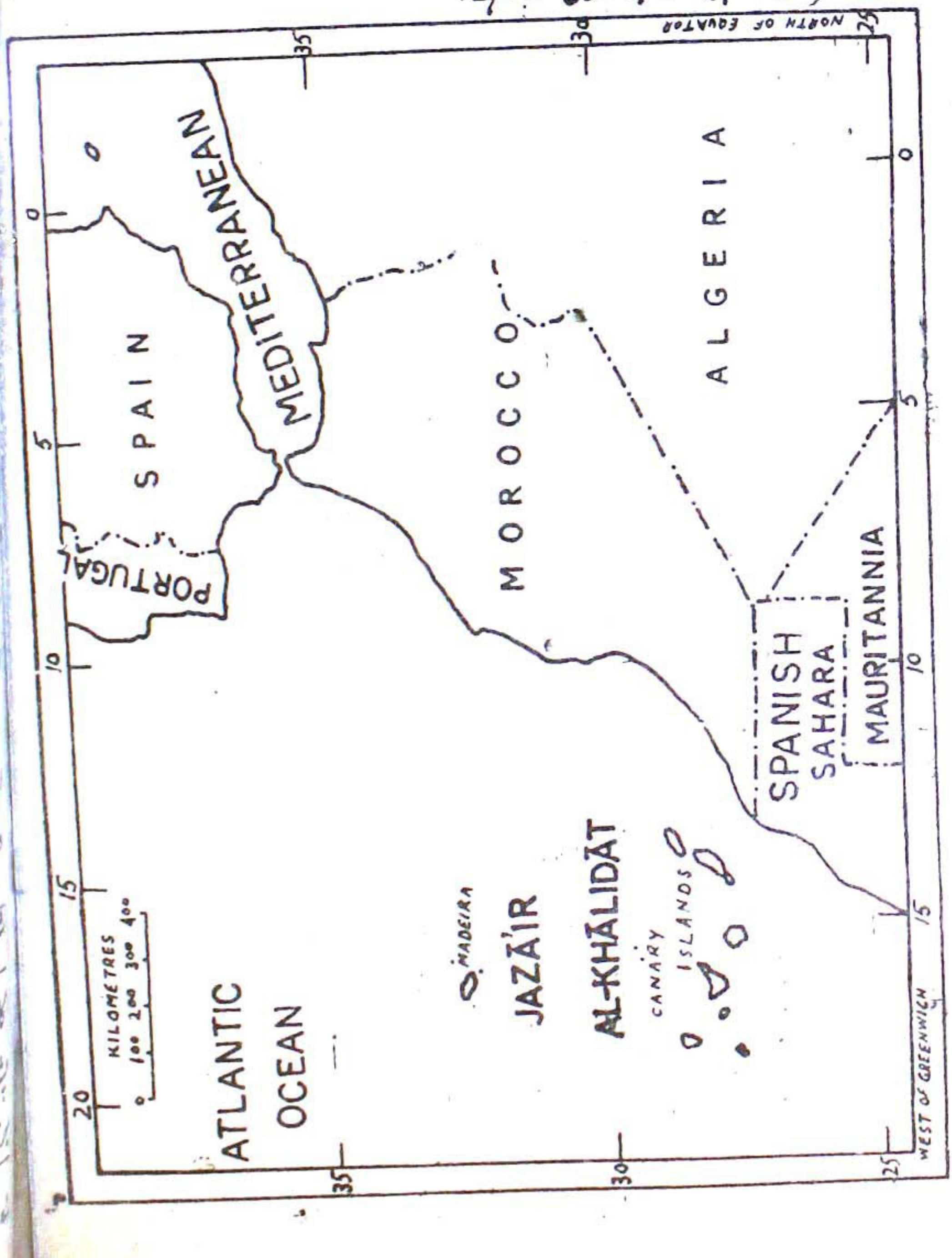

Marfat.com

لیکن اس کے بعد جب یورپ کی جغرافیائی بحث وتحقیقات کا نیا دور شروع ہوا تو پرانے طریقہ کی جگہ نئے طریقے رایج ہو گئے۔ اب جو نقشے بین القومی نظر و مطالعہ کے لیے بنائے جانے لگے ان میں جزیرۂ فرو (Ferro) کے خط کو نقطۂ صفر قرار دیا گیا تھا جو "ڈبلیو ۲۰ آف پیرس" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا لیکن ساتھ ہی ہر ملک کا رجحان اس طرف بھی جانے لگا تھا کہ اپنے نقشوں میں اپنے ہی دارالحکومت یا مرکزی رصدگاہ کے مقام کو حساب اطوال کا مبدء ٹھرائیں اور کسی دوسرے مبدء کو تسلیم نہ کریں۔ اس اختلاف کی وجہ سے جدید نقشوں کے لیے کوئی معیاری حساب پیدا نہ ہو سکا اور ہر ملک کا حساب دوسرے سے الگ ہو گیا۔ چونکہ یہ اختلاف بین القومی اتحاد علمی کو یک قلم ختم کر دیتا تھا اس لیے ۱۸۸۴ء کی واشنگٹن کانفرنس نے اس پر بحث کی اور پھر باتفاق سے گرین وچ (Greenwich) لنڈن کے خط کو نقطۂ صفر تسلیم کر لیا گیا۔ نتیجہ اب اطوال کا حساب تمام نقشوں میں گرین وچ کے خط ہی سے شروع کیا جاتا ہے۔

گرین وچ کا یہ خط ساحل افریقہ سے مشرق کی طرف تقریباً پندرہ درجہ ہٹا ہوا پڑا ہے۔ اس لیے قدیم اطوال کے حساب سے جو افریقہ کے مغربی ساحل کو نقطۂ صفر قرار دیتے تھے پندرہ درجہ کا بنیادی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ حساب کے جزئی اغلاط سے جو خلل سرایت کر گیا تھا اس کے نتایج اس کے علاوہ ہیں۔ اب اگر ہم البیرونی کے اطوال کا محل موجودہ زمانہ کے نقشوں میں معین کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پہلے دونوں کے حساب کا باہمی فرق معلوم کر لیں۔ جب یہ فرق ہم ہندوستان کے مقامات کے لیے نکالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی کے اطوال اور موجودہ زمانے کے نقشوں کے اطوال میں تقریباً ۲۶ درجوں کا فرق پڑ گیا ہے یعنی موجودہ نقشوں کے درجے پر اگر ۲۶ یا ۲۷ کا اضافہ کریں تو البیرونی کے اطوال کے درجے تقریباً نکل آتے ہیں۔ ہم یہاں بطور مثال کے چند شہروں کے درجے دونوں نقشوں کے درج کرتے ہیں جن سے یہ فرق واضح ہو جائے گا۔

شہر	موجودہ طول بلد	البیرونی کا طول بلد
کابل	۶۹	۹۵ - ۲۰
پشاور	۷۱ - ۵۰	۹۷ - ۱۰
برندرابن (متھرا)	۷۷ - ۴۴	۱۰۴ [1]

[1] ایک نسخے میں ایک سو چار ۱۰۴ ہے، ایک میں ایک سو تین ۱۰۳ (آزاد)

Marfat.com

اوجین	۷۵ - ۵۲	۱۰۰ - ۵۰
قنوج	۷۹ . ۵۸	۱۰۴
قلعہ گوالیار	۷۸ - ۴	۱۰۴ - ۱۰
نیپال	۸۴	۱۱۰
پریاگ (الہ آباد)	۸۱ - ۵۵	۱۰۷ - ۲۰

جہاں تک عروضِ بلاد کا تعلق ہے چونکہ اطوالِ بلاد کی طرح کوئی بنیادی اختلاف اس میں عارض نہیں ہوا اس لیے موجودہ زمانہ کے مقررہ عروض سے اگر البیرونی کے عروض مختلف ہیں لیکن بہت زیادہ فرق نمایاں نہیں ہے۔ مثال کے ہم بعض مقامات کا مقابلہ کرتے ہیں۔

شہر	موجودہ زمانہ کا عرض بلد	البیرونی کا عرض بلد
کابل	۳۴ - ۳۵	۳۳ - ۴۵
پشاور	۳۴ - ۱'	۳۳ - ۱۵
ملتان	۳۰ - ۵۶	۲۸
بندرابن (متھرا)	۲۷ - ۳۳	۲۷
اوجین	۲۳ - ۱۱	۲۴
قنوج	۲۷ - ۳	۲۶-۲۵
پریاگ (الہ آباد)	۲۵ - ۳۶	۲۵
تھانہ (بمبئی)	۲۱ - ۲۴	۲۰-۱۹
بنارس	۲۵ - ۱۸	۲۶ - ۱۵

اس موقعے پر یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ البیرونی کو ہندوستان اندرونی حصّوں کی سیر و سیاحت کا اور وہاں رصدی اعمال انجام دینے کا موقعے نہیں تھا۔ اس نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر پنڈتوں اور سیّاحوں روایتوں پر مبنی ہے یا اُن بیانات پر جو ہندوستان کے بعض مشہور شہروں کے متعل یونانیوں اور عربوں کی مصنفات میں درج ہو چکے تھے۔ وہ خود کتاب الہند میں

لہ القانون کے نسخوں میں اختلاف ہے۔ کتب خانہ ولایتین جار اللہ آفندی کے نسخے میں یہی عدد ہے، لیکن ایک دوسرے نسخے میں ۱۰۶ ہے، پروفیسر توگان نے دوسرے نسخے پر اعتماد کر ہے۔ (آزاد)

Marfat.com

لکھتا ہے۔

"میں نے قلعۂ لاہور کا عرض بلد رصدی عمل کے ذریعے معلوم کیا تو وہ ۳۴ درجہ اور ۳ دقیقہ کا نکلا۔ لاہور کے علاوہ جن دوسرے شہروں کا عرض بلد میں دریافت کر سکا ہوں ان کے نام یہ ہیں۔ غزنی۔ کابل۔ کندی۔ رباط الامیر۔ دنبور (یعنی موجودہ زمانہ کا جلال آباد) لمغان۔ پرشاور (پشاور) وے ہند (اٹک)، جیلم و جہلم)۔ قلعہ نندنہ (ٹلا)۔ ملتان۔ سیالکوٹ۔ مندکلور۔ ان مقامات سے ہم آگے نہ بڑھ سکے اور نہ ہندوؤں کی کتابوں سے ہمیں شہروں کے اطوال و عروض کا کچھ پتہ ملا۔" (الھند، صفحہ ۱۰۲)۔

ظاہر ہے کہ پنجاب کے ان شہروں کے علاوہ اور تمام مقامات کے عروض واطوال جو اُس نے مرتب کیے ہیں وہ ذاتی رصد و مشاہدہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتے، محض تخمین و قیاس سے معیّن کیے گئے ہیں، بلاشبہ اس کے سائنٹفک دماغ نے روایتوں کی جانچ پڑتال میں کمی نہیں کی ہوگی لیکن معاملے کی نوعیت ایسی تھی کہ بغیر ذاتی رصد و مشاہدہ کے حقیقت حال کا علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کتاب الہند میں خود کہتا ہے کہ ہندوستان کے راویوں اور سیّاحوں کے بیانات سے حقیقت حال کا علم حاصل کرنا نہایت درجہ دشوار ہے۔ اُن کے بیانات طرح طرح کی غلط فہمیوں، وہم پرستیوں اور مبالغہ آرائیوں میں ڈوبے ہوتے ہیں اور سامع کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ روایت کا کتنا حصّہ اوہام و خرافات پر مبنی ہے اور کتنا حقایق نفس الامری پر؟

ایک بڑی دشواری اُسے یہ پیش آئی کہ ہندوستان کے شہروں کی باہمی مسافت کی نسبت راویوں کے بیانات بے حد مختلف تھے اور جمع و تطبیق کا کوئی قابلِ وثوق ذریعہ موجود نہ تھا۔ وہ اس سلسلے میں بطلیموس کا بھی ذکر کرتا ہے کہ ایسی دشواری اُسے بھی پیش آئی ہوگی۔ (کتاب الہند، صفحہ ۹۷)

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ طرح طرح کی غلطیاں حساب میں سرایت کر جائیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی غیر معمولی کوشش و احتیاط بھی اُسے صورتِ حال کے قدرتی نقایص سے نہ بچا سکی اور مساحت کے اندازوں میں غلطیاں واقع ہو گئیں۔ مثلاً موجودہ پٹنہ تقریباً اسی محل پر واقع ہے جہاں قدیم عہد کا پاٹلی پتر آباد تھا۔ پٹنہ کا طول بلد ۸۵-۱۲ اور عرض بلد ۲۵-۳۷ ہے۔ البیرونی پاٹلی پتر کا

Marfat.com

طول بلد ۱۰۸۔۲۰ لکھتا ہے اور عرض بلد ۳۲۔۳۰۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں جو روایتیں اُس تک پہنچی تھیں وہ اصلیت کو صحت کے ساتھ واضح نہیں کرتی تھیں۔ اس نے بنارس سے پاٹلی پتر تک کا فاصلہ بیس فرسخ عربی قرار دیا ہے اور بنارس سے اُسے پورب میں ہٹا ہوا تصوّر کیا ہے، حالانکہ یہ دونوں باتیں صحت سے دور ہیں۔ ایسا ہی فرق گنگا ساگر کے محل وقوع میں بھی پڑ گیا کیونکہ صحیح فاصلہ اور صحیح جہت اس کے علم میں نہ آ سکی۔

اس عہد کی جغرافیائی تحقیقات کی بعض خصوصیتیں

البیرونی نے اپنی کتابوں میں جا بجا اپنی رصدی عملیات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس کے ذوقِ تحقیق کا کیا حال تھا؟ اور ایک سچے عالم اور محقق کی روح کس طرح اس کی شخصیت کے اندر کام کرتی رہتی تھی؟ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اُس نے اپنی ذاتی رصد و مشاہدہ سے کس طرح قدما کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ تحدید نہایات الاماکن میں (جس کے اہم مباحث ڈاکٹر توگان نے اس مجموعے میں شامل کر دیئے ہیں) لکھتا ہے۔

"میں نے دو مرتبہ جرجانیہ (گرگانج) کے عرض بلد کی رصدی اعمال کے ذریعے تحقیقات کی پہلی مرتبہ دریائے جیحون کے مغربی حصے میں، جو جرجان اور خوارزم کے درمیان واقع ہے، بوشکانر نامی گانوں کے اندر کی۔ اس گانوں کا عرض ۴۱-۲۶ تھا اور یہ واقعہ ۳۸۴ھ کا ہے۔ دوسری مرتبہ ۴۰۷ھ میں مجھے اس عمل کا خود شہر جرجانیہ میں موقع ملا اور مشاہدہ و عمل کے بعد یہ بات محقق ہو گئی کہ اس کا صحیح عرض بلد ۴۲-۱۷ ہے" (صفۃ المعمورہ، صفحہ ۵۸)۔

ایک دوسرے موقعے پر لکھتا ہے:

"میں نے ۳۸۵ھ میں کرۂ ارضی کے میل اعظم کی رصدی تحقیقات قریہ بوشکانر میں کی تھی جو خوارزم کے پہاڑوں کے اندر جیحوں کے مغرب میں واقع ہے۔ میں نے قریہ بوشکانر کا عرض بلد ۴۲-۲۶ پایا اور اس قریے اور جرجانیہ کی باہمی مسافت ۱۰ فرسخ تھی جسے میل کے حساب سے ۵۱ میل تصور کرنا چاہیے"۔

پھر ایک دوسرے موقعے پر لکھتا ہے:

"خوارزم کا عرض بلد ۴۱-۳۵ ہے اور یہ اعداد اس رصدی عملیہ کے مطابق ہیں جو میں نے اوایل عمر میں کیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ واقعہ ۳۸۰ھ یا اس کے قریبی زمانے کا ہے" (ایضاً صفحہ ۵۹)

ایک دوسرے موقعے پر لکھتا ہے:

Marfat.com

"جرجانیہ کے دارالامارت میں مجھے موقع ملا کہ نصف النہار کے ارتفاع کا رصدی عمل انجام دوں۔ ۱۱ ربیع الآخر ۳۷۰ھ مطابق ماہ مہر ۳۴۸ یزدجردی اور ۱۷ ایلول ۱۲۹۱ اسکندری کو میں نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ تر مدّ ہے اور وہ جرجانیہ کے تمام عرض سے جو مُرحَ ہے زیادہ ہے اور میں نے اپنی کتاب "التطریق الی تحقیق حرکۃ الشمس" میں اس رصدی عمل کو سورج کی درمیانی حرکت کی معرفت کے لیے بطور اصل کے قرار دیا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۶۰)

ایک اور موقعے پر لکھتا ہے:۔

"ابو علی الحسین بن عبداللہ ابن سینا کا ایک مکتوب میری نظر سے گزرا جو اس نے جرجان کے طول بلد کی تصحیح کی نسبت زرّین کیس بنت شمس المعالی کو لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا لیکن حالات ایسے تھے کہ نہ تو اُن مقامات کی مناسبت سے نتیجہ نکالا جا سکتا تھا جن کا طول بلد معلوم تھا اور نہ اس سال ایسا چاند گہن ہوا تھا کہ فلک النہار میں چاند کے ارتفاع کی جہت سے رصدی عمل انجام دیا جا سکتا۔ بہرحال اس نے رصدی عمل سے نتیجہ نکالنے کی کوشش کی تو طول بلد فَ وَ نکلا۔" پھر اس کے بعد اس طریقے کی تشریح کی ہے جو بو علی سینا نے اختیار کیا تھا اور آخر میں لکھتا ہے کہ "بو علی باوجود اپنی ذکاوت اور فطنت کے اپنے اس طریقے کے نتیجے پر پورا وثوق نہیں رکھتا تھا حالانکہ احتیاج اسی وثوق کی تھی۔"[1]

ایک دوسرے موقعے پر بلخ کی نسبت لکھتا ہے:

"۲۷۵ھ مطابق ۲۴۷ یزدجردی سلیمان بن عصمۃ سمرقندی نے بلخ میں رصدی عمل انجام دیا تھا .... منصور بن طلحہ کی نسبت بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس نے رصد میل سے بلخ کے طول بلد کا رصدی عمل انجام دیا۔ یہ فاضل شخص خراسان کے ولاۃ طاہریہ کی یادگار تھا اور علوم ریاضی اور اس کے متعلقہ علوم میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔" (ایضاً۔ صفحہ ۶۷)

نیشاپور کی نسبت لکھتا ہے:

نیشاپور کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ منصور بن طلحہ طاہری نے اس کا عرض بلد

۱۔ صفۃ المعمورہ، صفحہ ۶۵-۶۶۔ یہ ۲۵۷ یزدجردی ہے۔

Marfat.com

تو. ی پایا تھا اور ابوالعباس ابن حمدون نے بیان کیا ہے کہ اُس نے متعدد چاند سورج کے گہنوں کے موقعوں پر بغداد اور نیشاپور کے درمیان رصدی عمل انجام دیا تو معلوم ہوا کہ طول بلدیب ل ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بات محمد بن علی مکی کی کتاب استدارۃ السماء والارض میں مذکور ہے۔" ایضاً۔ (صفحہ ۶۷)

موجودہ زمانے میں جب آمد و رفت اور خبر رسانی کے نئے وسایل نے کرۂ ارضی کے دور دراز گوشوں کو بھی ایک دوسرے سے اس درجہ قریب کر دیا ہے کہ مہینوں کی مسافت گھنٹوں کے اندر طے کی جا سکتی ہے، رصد اور مشاہدات کے تمام بڑے بڑے اعمال دنیا کی مختلف رصدگاہوں کے باہمی اشتراک عملی کے ساتھ انجام دیے جاتے ہیں اور ایک ہی موقع اور حادثہ کا مختلف مقامات سے بہ یک وقت مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورج اور چاند کے گہن کے موقع پر اکثر ایسا کیا گیا ہے کہ یورپ اور ایشیا کے مختلف مقامات میں پہلے سے ارصاد و حساب، کا انتظام کر لیا گیا اور ایک مقام کے مشاہدہ و حساب کے نتائج فوراً تار برقی کے ذریعہ دوسرے مقامات پر پہنچا دیے گئے۔ داب تار برقی کے ذریعے کی بھی احتیاج باقی نہیں رہی کیونکہ لاسلکی کے ذریعہ تمام رصدگاہیں ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی ہیں لیکن لوگوں کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ چوتھی صدی ہجری یعنی ہزار دیں صدی عیسوی میں جب موجودہ زمانہ کے وسائل سفر و مخابرہ سے دنیا یک قلم محروم تھی بعینہٖ یہی طریق کار علمائے فن میں رایج ہو گیا تھا اور مہینوں اور برسوں کی مسافتیں بھی ان کے باہمی اشتراک عمل میں حارج نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ البیرونی اس کتاب میں لکھتا ہے۔

"میں نے اور ابوالوفا محمد بن محمد البوزجانی نے ۳۸۷ھ (مطابق ۹۹۸ء) میں باہم دگر مل کر چاند گرہن کا رصدی عمل انجام دیا۔ میں خوارزم میں تھا، ابوالوفا بغداد میں تھا۔ ان دونوں مقامات کے اعمال کے نتائج دونوں جگہوں کے خطوط نصف النہار کے قدرتی اختلاف کے ٹھیک مطابق ظہور میں آئے۔ اسی طرح میں نے کئی بار چاند گرہن کے موقع پر ارصاد کیا اور ہر مرتبہ ایک ہی مقدار ثابت ہوئی اگر کچھ فرق نکلا بھی تو اتنا کم کہ مقدار کی پکڑ میں نہیں آسکتا۔" (ایضاً۔ صفحہ ۵۹) اس طرح کے مشترک رصدی تجارب کے بعض دوسرے مواقع بھی البیرونی نے نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجۂ صدر واقعہ کوئی خاص مستثنیٰ واقعہ نہ تھا علاوہ بریں بعض دیگر ائمہ فن کی نسبت بھی ایسے ہی تجارب منقول ہیں مگر ان کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

البیرونی نے اپنی عملی جد و جہد ہر طرح کے موافق و مخالف حالات میں یکساں عزم وہمت کے ساتھ جاری رکھی اور وقت کا کوئی ہنگامہ اسی کے ذوقِ تحقیق کی طلب گاریوں پر غالب نہ آسکا وہ اسی کتاب میں ایک دوسرے موقعہ پر لکھتا ہے۔

" میں نے ۳۸۵ھ میں رصد کرنے کا پورا تہیہ کرلیا تھا اور اس غرض سے قطر کا ایک دایرہ پندرہ ہاتھ کا تیار کرایا تھا نیز ان تمام آلات کا بھی انتظام کرلیا تھا جو اس کے ساتھ مطلوب ہوتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مجھے زیادہ مہلت نہ مل سکی میں زیادہ سے زیادہ صرف یہ کر سکا کہ شہر خوارزم کے جنوب کے ایک گاؤں میں ارتفاع کی غایت کا اور نیز اس ارتفاع کا جس کی سمت متعین نہیں ہوتی، رصدی عمل انجام دے دوں جس دن اس عمل میں مشغول تھا سوئے اتفاق سے اسی دن خوارزم کے دو امیروں میں باہم گرمعرکہ آرائی پیش آئی۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا کام اچانک معطل ہوگیا۔ مجھے اک دوسری جگہ پناہ لینی پڑی۔ پھر وطن کے ترک کرنے پر مجبور ہوگیا اور اس کے بعد برسوں تک سکونِ خاطر نصیب نہیں ہوا۔" (صفحہ ۵۹)

البیرونی نے مندرجۂ صدر بیان میں خوارزم کے جس ہنگامہ کا ذکر کیا ہے اس کی مختصراً تفصیل یہ ہے۔ اُس عہد میں یہ علاقہ دو امیروں میں ٹبا ہوا تھا ایک حصہ ماموں بن محمد کے قبضہ میں تھا جس کا دارالحکومت جرجانیہ یعنی گرگانج تھا، دوسرا حصہ ابو عبداللہ محمد بن احمد خوارزم شاہ کے قبضے میں تھا جس کا دارالحکومت کاث تھا۔

رمضان ۳۸۵ھ مطابق ۹۹۵ء میں امیر ماموں نے کاث پر چڑھائی کی اور ابو عبداللہ کو قتل کرکے اس کا علاقہ اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ ابو عبداللہ کا خاندان آل عراق کہلاتا تھا اور البیرونی کا سرپرست تھا۔ اسی خاندان کا ایک رُکن ابو النصر منصور بن علی تھا جس کی نسبت البیرونی نے اپنے ایک قصیدہ میں تصریح کی ہے کہ اس کی سرپرستیوں سے میری علمی زندگی کی بنیادیں استوار ہوئیں:

فآل عراق قد غذونی بدرھم
ومنصور منھم قد تولیٰ غراسیا

(یعنی آلِ عراق نے اپنی فیاضیوں سے مجھے نشوونما دی اور انہی میں منصور تھا جس نے میری زندگی کی بنیادیں استوار کردیں)

جس وقت خوارزم کی سرزمین قتل و نہب کا یہ کھیل کھیل رہی تھی البیرونی اس کی آبادیوں سے باہر ایک گاؤں کے میدان میں اپنی رصد بندیوں کے پُرسکون اعمال میں مشغول تھا۔ جس دن امیر ماموں نے کاث کے شاہی محل میں ابو عبداللہ کو گرفتار کیا

اُسی دن البیرونی نے اپنی رصدگاہ کو ایک نئے دایرۂ قطر اور اس کے متعلقہ آلات سے آراستہ کیا تھا اور زمانے سے صرف اتنی مہلت کا آرزومند تھا کہ اسے اپنے رصدی عملیہ کے نتایج قلم بند کرنے کا موقع مل جائے: وما احسن ما قیل بالفارسیہ:

نہ گویم اے فلک کز کجروی ہایت توبرگردی
شب وصل ست، خواہم ایں قدر آہستہ ترگردی

(اے آسمان! میں یہ نہیں کہتا کہ تو اپنے ظلم وستم سے باز آجا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آج وصل کی رات ہے۔ ذرا آہستہ چال سے چل کہ صبح جلد نہ طلوع ہوجائے!)

لیکن افسوس ہے زمانہ کے بے رحم انقلابات نے اُسے اتنی مہلت بھی نہ دی

ابوالعباس مامون کے عہد میں آلِ عراق کی سی سرپرستیاں البیرونی کو نہیں مل سکتی تھیں تاہم اُسے اپنے علمی اشغال کے جاری رکھنے کا موقع مل گیا تھا لیکن اس کے بعد پھر دوسرا انقلاب پہلے سے بھی زیادہ سخت ہوا، یعنی ۴۰۸ھ مطابق ۱۰۱۷ء میں محمود غزنوی نے خوارزم پر حملہ کرد یا اور مامونیوں کا خاندان حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اب البیرونی کی زندگی غزنی کے دربار سے وابستہ ہوگئی تھی لیکن یہی زمانہ اس کی زندگی کا ایسا زمانہ ہے جسے تاریخ کی نگاہیں ابھی تک علم وتفصیل کے ساتھ نہیں دیکھ سکی ہیں۔

غزنی کے متعلق اس کتاب میں لکھتا ہے:

"ان واقعات کے بعد پھر ایسا اتفاق پیش آیا کہ میں نے غزنہ (غزنی) میں غایت ارتفاع کا رصدی عمل انقلاب صیفی کے زمانے میں انجام دیا۔۔۔۔ میں نے انقلاب شتوی کے نصف النہار کا ارتفاع ۳۸۸ھ یزدگردی میں ۳۲۔ جزء اور جزء کا چھٹا حصہ پایا پس میل اعظم ۳۸۔۴۵ ہونا چاہیے۔ غزنہ کا عرض ۳۸۔۴۵ ہے۔" (صفحہ ۵۹)

Marfat.com

محمود غزنوی اور البیرونی

البیرونی کی زندگی کا آخری زمانہ غزنی میں گزرا۔ اس نے ہندوستان کی سیاحت اسی عہد میں کی اور ہندوستان کے علوم پر تمام کتابیں اسی عہد میں لکھیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی سے اس کے تعلقات کی نوعیت کیسی تھی؟ سلطان نے اس کی علمی زندگی کی سرپرستی کی تھی یا اس کی طرف سے بے پروا رہا تھا، یا پھر دونوں کے باہمی تعلق میں اس سے بھی زیادہ کوئی بات کام کرتی رہی تھی؟

کتاب الہند میں ایک جگہ اپنے قیام ہند کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی نے بعض اشارات ایسے کیے ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنی طلب اور مرضی کے مطابق کام نہیں کر سکتا تھا اور اس پر کچھ پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے:

فهذه صورة الحال ولقد اعيتني المداخل فيه مع حرصي الذي تفردت به في ايامي وبذلي الممكن غير شحيح عليه في جمع كتبهم من المظان، واستحضار من يهتدي لها من المكامن ولمن غيري مثل ذلك الا ان يرزق من توفيق الله ما حرمته في القدرة على الحركات عجزت فيها عن القبض والبسط في الامر والنهي طوي عني جانبها، والشكر لله على ما كفى منها۔

ہندوستان میں جو صورت حال مجھے پیش آئی وہ یہ تھی کہ باوجودیکہ علم کی حرص میں منفرد ہوں اور میں نے ہر طرح کی کوشش کرنے میں بھی کمی نہیں کی، میں نے ہر ایسی جگہ سے جس کا گمان کیا جا سکتا تھا کتابیں جمع کرنی چاہیں اور ایسے لوگوں سے کام لینا چاہا جو ان کی مخفی جگہوں کا سراغ بتا سکتے تھے نیز روپیہ خرچ کرنے سے بھی ہاتھ نہیں روکا تاہم مجھے کام کی بے روک راہ نہ ملی اور ان راہوں میں قدم بڑھانے کی کوشش نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں اپنی مرضی سے کام نہیں کر سکتا تھا اور امر و نہی کے احکام میں بے بس تھا، اب وہی شخص

Marfat.com

اس کمی کو پورا کر سکے گا جسے نقل وحرکت
کی وہ آزادیاں خدا کی توفیق سے میسر آجائیں
گی جن سے مجھے محروم رہنا پڑا۔

ڈاکٹر اڈورڈ ذخاؤ (سخاؤ) نے جنھوں نے کتاب الہند کی تصحیح کی ہے اور پھر اس کا انگریزی ترجمہ مرتب کیا، اس تصریح سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ پنجاب میں البیرونی کو نقل و حرکت کی پوری آزادی حاصل نہ تھی اور سلطان محمود سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے چونکہ سخاؤ کے پیش نظر البیرونی کی دوسری مصنفات نہ تھیں اس لیے وہ اس بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

لیکن اب تحدید نہایات الاماکن کے بعض مقامات سے مزید اشارے نمایاں ہو گئے ہیں اور ایک مقام پر تو بالکل واضح لفظوں میں اُس نے اپنی پُرمصائب زندگی کا شکوہ کیا ہے، وہ اس کتاب کی اُس فصل میں جو شہروں کے عرض بلد اور میل کلی وجزئی کی معرفت کے بارے میں لکھی ہے، لکھتا ہے:

وانی یوم کتبتی ھذا الفصل وھو یوم الثلاثا رغرۃ جمادی الاخرہ سنۃ تسع واربعمایۃ للھجرۃ کنت بجیغور قریۃ الی جنب کابل وقد حملنی شدۃ الحرص علی رصد عروض ھذہ المواضع وانا ممتحن بما اظن ان نوحا ولوطا علیھما السلام لم یمتحنا بمثلہ وراج ان اکون ثالثھما فی نیل رحمۃ اللہ والغیاث بمنہ... فاجتمع نہ یط وذلک تمام عرض کابل ... (صفحۃ المعمورہ، صفحہ ۶۰)

جس دن میں نے یہ فصل لکھی اس روز میں کابل کے قریب جنیغور نامی ایک قریے میں مقیم تھا اور یہ منگل کا دن اور جمادی الآخر کا مہینہ تھا اور چارسو نو برس (۴۰۹ھ) ہجرت پر گزر چکے تھے۔ مجھے یہاں کی اقامت پر میری حرص کی اس شدت نے مجبور کیا جو ان مقامات کے عروض کی تحقیق و معرفت کے لیے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ میں آجکل ایسی آزمائشوں میں ڈال دیا گیا ہوں کہ شاید حضرت نوح اور حضرت لوط علیہم السلام بھی ایسی آزمائشوں میں نہ ڈالے گئے ہوں گے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ خدا کی رحمت کے حصول اور اس کی طلب و فریاد کے لحاظ سے ان دونوں کے ساتھ میں تیسرا ہوں گا۔ بہرحال کابل کا عرض نہ یط ثابت ہوا۔

Marfat.com

یہ تصریح کتاب الہند کی تصریح کی طرح رمز و کنایہ میں نہیں ہے بلکہ صاف اور واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۹ھ میں وہ اپنی زندگی کو اس درجہ مصیبت زدہ محسوس کرتا تھا کہ اسے حضرت نوح اور حضرت لوط کی مصیبتیں یاد آگئی تھیں۔ ان دونوں پیغمبروں کو جو مصیبت پیش آئی تھی اس کی نوعیت کیا تھی؟ وہ ان کی قوم کا انکار اور جحود تھا۔ ایک بڑی مدت تک وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے لیکن اُن کی کوئی کوشش سود مند نہ ہوئی اور بالآخر انھیں یک قلم مایوس ہو جانا پڑا۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ کیا اُس عہد میں البیرونی کی مصیبتیں بھی اسی نوعیت کی مصیبتیں تھیں؟ کیا وہ ایسے لوگوں میں گھرا ہوا تھا جنھیں وہ اپنے اخلاصِ عمل اور صداقتِ مقصد کا یقین نہیں دلا سکتا تھا؟ اور وہ اُنھے برابر شک و شبہ اور انکار و عناد کی نظروں سے دیکھتے تھے یہاں تک کہ اُسے اصلاح حال کی طرف سے بالکل مایوس ہو جانا پڑا تھا؟ اگر اس تصریح کے پیچھے یہ تمام تفصیلیں چھپی ہوئی ہیں تو ہمیں چاہیے کہ زیادہ گہرائی میں اُتریں اور دیکھیں کہ صورتِ حال کی یہ نوعیت البیرونی کے غزنوی گرد و پیش سے کیوں کر مطابق کی جا سکتی ہے؟

خوارزم کی تاریخ سے ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کا وہاں تسلط ۴۰۸ھ میں ہوا تھا اور اسی سال کے بعد سے البیرونی کی دربار غزنی سے وابستگی شروع ہوئی۔ پس ۴۰۹ھ کا زمانہ یقیناً وہی زمانہ تھا جب البیرونی نیا نیا سلطان محمود کے دربار میں پہنچا تھا اور ابھی اس صورتِ حال پر زیادہ سے زیادہ ایک برس کی مدت گذری تھی۔ اس ایک برس کے اندر حالات کی جو رفتار رہی اُس کے اثرات ہم البیرونی کی مندرجۂ صدر تصریح میں دیکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک سخت مصیبت زدہ انسان تصور کرتا ہے اور ایسے پیغمبروں کے حالاتِ زندگی میں اپنی حالت کی مشابہت ڈھونڈتا ہے جن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی اصلاح سے یک قلم مایوس ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کی کوئی معقول توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ہم البیرونی اور سلطان محمود کے باہمی علایق کو ان کی انتہائی کشیدگیوں اور ناخوش گواریوں کے ساتھ اپنے سامنے نمایاں ہونے دیں۔ جونہی صورتِ حال کی یہ تصویر نمایاں ہوتی ہے معاملہ اپنی پوری تفصیلی شکل میں ابھر آتا ہے اور البیرونی کے مندرجۂ صدر لفظوں کے اندر واقعات و حوادثات کی ایک طول طویل داستان بولنے لگتی ہے۔

دربار غزنی سے البیرونی کی وابستگی ناخوشگوار حالات میں ہوئی تھی۔ تاہم اسے امید تھی کہ اس کے علم و فضل سے تغافل نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی حسنِ نیت اور اخلاصِ عمل کی طرف سے سلطان کو مطمئن کر سکے گا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور اس کی کوئی کوشش بھی سلطان کو مطمئن اور خوش گمان نہ بنا سکی۔ اب وہ ایک عجیب لاعلاج حالت میں اپنے آپ کو مبتلا پاتا ہے نہ تو اس پر قادر ہے کہ سلطان کے دایرہ اقتدار سے باہر چلا جائے نہ اس کی توقع رکھ سکتا ہے کہ غزنی ہی میں رہے اور مطمئن اور خوش حال رہے گویا زندگی کی دونوں ممکن راہوں کا دروازہ اس پر بند ہو چکا تھا۔ صورتِ حال کی یہی منزل ہے جہاں پہنچ کر اسے مایوسی کا آخری تلخ گھونٹ پینا پڑا اور بے اختیار اس کے قلم سے نکل گیا کہ نوح اور لوط علیہم السلام کو یاس و قنوط کے جس امتحان کے مرحلے سے گزرنا پڑا تھا وہی مرحلہ مجھے بھی پیش آگیا ہے۔ اس صورتِ حال کی وضاحت کے لیے ہمیں حسب ذیل امور پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) البیرونی کی نشوونما خوارزم میں ہوئی۔ ملوک خوارزم اس کے سرپرست تھے اور ابوالعباس مامون کا تو وہ معتمد خاص تھا جس سے سلطان محمود نے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی۔ بالآخر محمود نے حملہ کیا اور خوارزم پر قابض ہو گیا۔ محمود کی نسبت تمام مورخوں کا بالاتفاق بیان ہے کہ وہ سخت سفلی طبیعت کا آدمی تھا اور ہر ایسے شخص کو جو وقت کے کسی دوسرے دربار سے وابستگی رکھ چکا ہو معاندانہ نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں البیرونی کی شخصیت اس کی نظروں میں ضرور ایک مشتبہ شخصیت بن گئی ہو گی۔ وہ اسے ملوک خوارزم کا نمک پروردہ اور معتمد علیہ سمجھ کر شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہو گا۔ اس کی نگرانی کی جاتی ہو گی اور اسے نقل و حرکت کی آزادی حاصل نہ ہو گی۔

(۲) البیرونی سلطان کے دربار میں پہنچا کیونکر؟ اس بارے میں متضاد نوعیت کی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں، تاہم ایک بات ان سب میں قدر مشترک ہے یعنی وہ کوئی خوشگوار صورتِ حال نہ تھی۔ یاقوت الحموی نے معجم الادبا میں بعض افاضل وقت کی طرف منسوب کر کے ایک روایت نقل کی ہے کہ فتح خوارزم کے بعد سلطان محمود نے البیرونی اور اس کے استاد عبدالصمد اوّل بن عبدالصمد الحکیم کو گرفتار کرایا تھا۔ عبدالصمد کو تو قرمطی قرار دے کر قتل کر دیا گیا مگر البیرونی بچ گیا کیونکہ سلطان سے کہا گیا یہ بہت بڑا نجومی ہے اور اس کی مہارت فن سے فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں اور صاحب نگارستان نے نگارستان میں ایک دوسری روایت بھی لکھی

ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ سلطان نے فتح خوارزم سے پہلے ایک ایلچی خوارزم بھیجا تھا اور دربار خوارزم کے پانچ حکیموں کو جن میں ایک ابوعلی سینا تھا اپنے یہاں طلب کیا تھا، وہ سب سے زیادہ خواہش مند ابن سینا کا تھا لیکن ان پانچ میں سے دو یعنی ابوعلی سینا اور ابوسہل غزنی جانے پر رانسی نہ ہوئے اور خوارزم سے نکل گئے مگر البیرونی، ابوالخیر اور ابونصر نے دربار غزنی کی وابستگی منظور کر لی، چونکہ اس کارروائی سے اصل مقصود ابوعلی سینا کی طلبی تھی اور وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اس لیے سلطان کی طبیعت سخت رنجیدہ ہوئی اور ان تین حکیموں کی نجوم دانی کا امتحان لیا گیا۔ نظامی نگارستان کی یہ روایت رطب و یابس کا مجموعہ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعے کے چند تاریخی اجزا، افسانہ گوئی کے اجزا سے مخلوط ہو گئے ہیں، تاہم اس سے بھی صورت حال کی جو نوعیت سامنے آتی ہے اس سے یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ البیرونی کا دربار غزنی میں داخلہ خوشگوار حالات میں نہیں ہوا تھا۔ اس لیے افسانہ طرازوں نے طرح طرح کی کہانیاں مشہور کر دی تھیں۔

(۳) ایک بات صاف اور قطعی ہے۔ سلطان محمود نے البیرونی کے ساتھ جو سلوک بھی کیا ہو اس کی تہہ میں اس کے علم و حکمت کی صحیح معرفت اور قدر شناسی نہ ہو گی، یہ غلط فہمی ہو گی کہ وہ فنِ نجوم (اسٹرالوجی) میں ماہر تھا

علوم فلکیہ کی تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ علم ہیئت اور فنِ نجوم یعنی سعادت و نحوست کواکب کے فن کا باہمی فرق مدتوں تک غیر واضح رہا۔ جو امتیازی خط دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے، وہ قدیم زمانے میں اتنا باریک تھا کہ عام نگاہیں بہت کم اسے محسوس کر سکتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہیئت کے ماہر کو فنِ نجوم کا ماہر سمجھ لیا جاتا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابومحمود الخجندی، ابن جابر البتانی، ابومعشر الفلکی، عمر الخیام، نصیر الدین الطوسی وغیرہم جنھیں فنِ نجوم کے اوہام و خرافات سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا محض اس لیے نجومی مشہور ہو گئے کہ لوگوں نے ان کی نگاہیں ستاروں کی طرف اٹھی ہوئی دیکھی تھیں اور وہ خیال کرتے تھے کہ ستاروں کی حرکات کا مطالعہ صرف اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ فنِ نجوم کا اعتقاد اسی رُخ پر لے جاتا ہے۔ نظامی سمرقندی اور صاحب نگارستان نے البیرونی کی نسبت جو حکایتیں لکھی ہیں ان کے اندر بھی یہی غلط فہمی کام کر رہی ہے۔ البیرونی کے بے لاگ علمی دماغ کا تو یہ حال تھا کہ جس شخص کو ریاضی و ہیئت کے ساتھ فنِ نجوم کے اعمال و احکام سے بھی دلچسپی ہوتی وہ اس کے بیانات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا کیونکہ وہ خیال کرتا کہ بہت ممکن ہے فنِ نجوم کے عقیدہ سے اس کا رصدی عمل غیر محسوس طریقے پر متاثر ہو گیا ہو۔

Marfat.com

چنانچہ اس نے نیشاپور کے طول بلد کی بحث میں منصور بن طلحہ کی تصریح کو صرف اس لیے مشکوک ٹھیرایا کہ "کان مولعاً بعلم النجوم"، وہ علم نجوم سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن زمانے کی غلط اندیشیوں کا یہ تصرف دیدنی ہے کہ ایسا محتاط شخص بھی نجومی ہونے کے اتہام سے محفوظ نہ رہ سکا، وللہ در ما قال:

مریم این را متحمل شد و عیسیٰ برداشت

البیرونی کے عہد سے تقریباً پچاس ساٹھ سال بعد امام فخرالدین الرازی نے اپنی مشہور تفسیر لکھی ہے۔ وہ سورۂ کہف کی تفسیر میں ایک جگہ البیرونی کا قول ذوالقرنین کی شخصیت کی نسبت نقل کرتے ہیں اور اس کا نام اس طرح لکھتے ہیں کہ "ابوالریحان البیرونی المنجم"۔

یہ روایت کہ سلطان محمود نے البیرونی کی جان بخشی اس کے نجومی ہونے کے خیال سے کی صحیح ہو یا نہ ہو لیکن سلطان کی دماغی استعداد پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ البیرونی کے علمی مقام کی اندازہ شناسی کے لیے وہ قطعاً غیر مستعد تھا اور اس کے فلکی اعمال کے ذوق و انہماک کو صرف اسی صورت میں دیکھ سکتا تھا کہ اُسے نجومی تصور کر لے۔ اس سے زیادہ کے لیے اس کے پاس کوئی دماغی استعداد نہ تھی۔ اس صورتِ حال میں بھی ہمیں البیرونی کے احساسات کی تلخی اور مایوسی صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ ایک ایسے بادشاہ کی سرپرستی اسے کیوں کر مطمئن اور خوشحال کر سکتی تھی جو زیاضیات اور ہیئت کے ایک باکمال شخص کی قدرشناسی کے لیے کوئی ذہنی استعداد نہیں رکھتا تھا اور اگر قدرشناسی کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو صرف اس لیے کہ اسے فنِ نجوم کے اوہام و خرافات کے اعتقاد سے متہم تصور کر لے۔

(۴) سلطان محمود کی دماغی اور اخلاقی سیرت کے جس قدر حالات تاریخ کے اوراق نے محفوظ کر لیے ہیں، ان سے ہم اس غیر معمولی شخص کے اندازِ طبیعت کی ایک تصویر کھینچ لے سکتے ہیں۔ اس میں عزم و عمل اور ہمت و شجاعت کے بے نظیر اوصاف تھے۔ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا فوجی سپہ سالار تھا۔ اس کی حکمرانی کا دامن شخصی حکمرانوں کے ظلم و ستم کے عام دھبوں سے کم داغ دار ہوا۔ وہ بقول انگریز مورخ گبن کے میدان جنگ میں کتنا ہی خونخوار نظر آتا ہو مگر تختِ حکومت پر عدل و مساوات کا خواستگار تھا لیکن ان تمام اوصاف کے ساتھ اس کی دماغی شخصیت کا دوسرا رخ بھی ہمیں نمایاں کرنا پڑتا ہے۔ وہ کامل معنوں میں اپنے عہد کا ایک ترک سپاہی تھا اور علوم و معارف کے میدانوں میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اُس کے دینی عقاید

کا تصور نہایت پست اور محدود درجہ کا تھا۔ وسعتِ نظر کی کوئی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑی تھی۔ اس زمانہ میں اسماعیلی فرقہ کے مبلغ عالم اسلامی میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کی ایک شاخ نے جو قرامطہ کے نام سے مشہور ہوئی، عراق اور حجاز میں سخت ہلچل مچا دی تھی۔ مصر میں فاطمی خلافت قائم ہو چکی تھی اور اس کے داعی تمام عالم اسلامی میں ظاہر و مخفی اپنی دعوت پھیلا رہے تھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے مذہبی عقاید کو عقلی توجیہات کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے اور فلسفہ و عقلیات کے حامی تھے اس لیے سلطان کے خیال میں ہر شخص جو حکیمانہ فہم و ذوق رکھتا ہو قرمطی تھا اور اس لیے واجب القتل تھا۔ اس نے اپنے دورانِ حکومت میں بے شمار آدمیوں کو محض اس لیے قتل کرایا کہ وہ اسماعیلیت اور قرمطیت سے متہم ہو گئے تھے اگرچہ فی الحقیقت اسماعیلی نہ تھے۔ یاقوت الحموی نے معجم میں اور ظہیر الدین البیہقی نے تتمۂ صوان الحکمۃ میں ایک روایت نقل کی ہے۔ جس سے سلطان کی اس ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سلطان کے دربار میں شمالی چین یعنی ختا کا ایک ایلچی آیا تھا جو تعلیم یافتہ آدمی تھا اور قطب شمالی[1] کے قرب و جوار کی بعض خصوصیات سے واقف تھا۔ اس نے سلطان سے کہا کہ قطب کے قرب و جوار میں ہمیشہ سورج کی روشنی نمایاں رہتی ہے اور رات کی تاریکی کا وقت ظہور میں نہیں آتا۔ سلطان نے اپنی عادت کے مطابق اس بیان کو الحاد اور قرمطیت پر محمول کیا حالانکہ اس شخص کو اس طرح کے عقاید سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ سیاحوں کا مشاہدہ بیان کر رہا تھا نہ کہ اپنا ذاتی عقیدہ۔ بہرحال اس موقع پر البیرونی کی دانش و حکمت ناکام نہیں رہی۔ وہ سورج اور زمین کا باہمی تعلق واضح کرتا ہے اور سلطان کو یقین دلاتا ہے کہ دونوں قطبوں کے پاس اس طرح کی صورتِ حال کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اس سے انکار کرنا ایک علمی حقیقت سے انکار کرنا ہوگا۔ (المعجم، جلد ۲، صفحہ ۳۱ و تتمۂ صوان الحکمۃ، نسخہ کتب خانہ ملا مراد، استنبول)۔

فقال مروزی نے سلطان کے شافعی مذہب اختیار کرنے کی جو حکایت نقل

---

[1] معجم اور تتمۂ صوان الحکمۃ دونوں میں "قطب جنوبی" کا لفظ ہے لیکن ای۔ وائڈمین (E.Wiedemann) نے معجم کی روایت پر بحث کرتے ہوئے اسے راوی یا کاتب کی غلطی سے تعبیر کیا ہے اور خیال کیا ہے کہ اصل میں قطب شمالی ہوگا کیونکہ قطب جنوبی کی نسبت ایک چین کے کو کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔ میں بھی خیال کرتا ہوں کہ قطب شمالی ہی ہونا چاہیے۔ (آزاد)

کی ہے اس سے بھی ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس کی مذہبی معلومات کا کیا حال تھا؛ سلطان کا خاندان، عام ترکوں کی طرح حنفی تھا لیکن علما* دربار میں بعض شوافع موجود تھے اور وہ شافعی مذہب کی فضیلت پر زور دیتے تھے۔ خود سلطان اس کوچے سے اس درجہ نابلد تھا کہ ان کی باتیں سنتا اور کوئی رائے قائم نہ کرسکتا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ ایک مجلس مناظرہ ترتیب دی جائے اور مسیحی عالم کو حکم بنایا جائے۔ یہ مسیحی عالم غالباً ابو الخیر الحسن بن سوار معروف با بن الخمار تھا۔ اس علمی مناظرہ میں علمی حیثیت سے کوئی بحث نہیں ہوئی بلکہ یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ سلطان کے سامنے حنفی اور شافعی دونوں طریقوں کی نمازیں پڑھ کر دکھا دی جائیں جس طریقہ کی نماز سلطان کو پسند آجائے اسے اختیار کرلے۔ چنانچہ شافعی طریق نماز بازی لے گیا اور سلطان شافعی ہوگیا۔

اسی طرح ابوبکر ابن فورک الاصفہانی کے ساتھ جو معاملہ مسائل رویت وجہت کے بارے میں پیش آیا تھا اور جس کی تفصیلات خود ابن فورک نے اپنے مکتوب بنام ابو اسحاق الاسفرائینی میں لکھی ہیں، اس حقیقت کو واضح کردیتا ہے کہ سلطان کا سیدھا سادھا سپاہیانہ دماغ کسی علمی اور دقیق بات کے سمجھنے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ ابن فورک نے بہت کوشش کی کہ رویت باری بلا جہت و محل کا عقیدہ اس کے ذہن نشین ہوسکے لیکن کسی طرح بھی نہ ہوسکا اور وہ بار بار فارسی میں یہ کہتا رہا کہ کیف یعقل شیئ لا فی جہتہ؟

(۵) سلطان کی طبیعت کا سخت تنگی اور ہٹ دھرم واقع ہونا بھی ہمیں تاریخی تصریحات سے معلوم ہوچکا ہے۔ وہ استقامت طبع اور ہٹ دھرمی میں فرق نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ہٹ دھرمی کو استقامت رائے سمجھ لیا تھا۔ ایسی طبیعت کا بادشاہ یقیناً البیرونی جیسے حکیمانہ مزاج کے آدمی کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا ہوگا اور نہیں معلوم اسے شب و روز کس طرح کی مصیبت انگیز زندگی بسر کرنی پڑی ہوگی۔

خود البیرونی کی بعض تصریحات سے بھی اس صورت حال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب الجماہر میں ایک جگہ موتیوں کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

وقد شوهد من فعلها (ای النار)	اور موتیوں پر آگ کا فعل جو اثر ڈالتا ہے
باللآلی فی بیوت الاصنام التی	وہ اس موقع پر دیکھنے میں آیا تھا جب
احرقها الغزاة بجدود برانه (ای	برانہ (یعنی بلندشہر حالی) کے بت خانوں
بلندشهر الحالی) ... فکان لونها	کو غازیوں نے آگ لگا کر جلا دیا تھا۔

Marfat.com

صاحبها الماسور فی ید الامیر یمیلن الدولة راسله بان هؤلاء المجانین یخسرونک فی الجواهر بما یعظم مقداره فارفعها ثم خلهم والاحراق فلم یلتفت الی قوله اصراراً کعادته کانت فی المخالفة وکان بعد خمود النیران یفتش رمادها فیوجد فیها الحبات الکبار النفیسة کانما خرطت من طباشیر ولم یوجد ما ینتفع به
(صفة المعمورة صفحہ ٢٧)

برانہ کے راجہ نوہرا نے جو امیر یمین الدولہ کے ہاتھ قید ہو چکا تھا اسے اس مضمون کا پیغام بھیجا کہ یہ دیوانے نمازی چاہتے ہیں کہ بت خانوں کو جلا کر تجھے ان نہایت قیمتی جواہر سے محروم کر دیں جو ان کے اندر موجود ہیں۔ تجھے چاہیے کہ پہلے ان جواہر کو وہاں سے نکال لے ورنہ وہ بھی جل کر راکھ ہو جائیں گے مگر امیر نے راجہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں کی کیونکہ یہ اسکی عادت تھی کہ ہر بات جو کہی جاتی تھی اسکی مخالفت کرتا تھا اور اپنی بات سے نہیں ہٹتا تھا۔ لیکن جب آتش زدگی کے بعد جلے ہوئے بت خانوں کی تفتیش کی گئی تو اس میں جلے ہوئے موتیوں کے دانے اس طرح ملے جیسے طباشیر کے ٹکڑے ہوں کیونکہ وہ جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔

بہرحال البیرونی نے تحدید نہایات الاماکن میں اپنے حالات کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ ہمیں بہت دور تک لے جاتا ہے اور ہم اس کے اور سلطان محمود کے رشتہ علایق کی نوعیت کی ایک تفصیلی تصویر کھینچ لے سکتے ہیں۔ اس نے کتاب الہند میں جو مجمل اشارہ کیا ہے اس کا مطلب بھی اب اچھی طرح واضح ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسے پنجاب آنے کا موقع تو مل گیا تھا لیکن نقل و حرکت کی پوری آزادی نہیں ملی تھی اور اس کی علمی تحقیقات کی سرگرمیوں میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈال دی گئی تھیں۔ ان ہی رکاوٹوں کی طرف اس نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ "اپنے حالات کے امر و نہی کا رشتہ میرے قبضے میں نہیں ہے"

لیکن اگر محمود کی طرف سے البیرونی کے تاثرات کا یہ حال تھا تو پھر البیرونی نے اپنے اُس قصیدہ میں جسے الحموی نے معجم میں نقل کیا ہے محمود کا ذکر ان لفظوں میں کیوں کیا تھا؟

Marfat.com

ولم ینقبض محمود عنی بنعمۃ — فاغنی واقنی مغضیاً عن مکاسبا
عفا عن جہالاتی وابدی تکرماً — وطری بجاہ رونقی ولباسیا

یعنی محمود نے کوئی نعمت مجھے عطا کرنے میں کمی نہیں کی، اُس نے مجھے غنی کر دیا اور میری زیادہ طلبی سے چشم پوشی کی۔ اس نے میری نادانیوں سے درگزر کی اور میری عزت کرنے لگا۔ اس کے جاہ و جلال سے میری رونق تازہ ہو گئی۔ یہ قصیدہ اس نے ابوالفتح بُستی کی مدح میں لکھا تھا۔ اس میں اپنی زندگی کے مختلف دوروں کی طرف اشارات کئے ہیں۔

البیرونی کی ان دونوں مختلف تصریحات کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اور سلطان محمود کے باہمی علایق کے مختلف دور رہے ہوں گے۔ ابتدائی دور کشیدگی، شک و اشتباہ اور ناقدر شناسی کا تھا پھر حالات کی رفتار بتدریج بدلنے لگی اور بالآخر ایک ایسا دور رونما ہو گیا جب سلطان کی فیاضانہ سرپرستی اُسے حاصل ہو گئی تھی۔ البیرونی نے یہ قصیدہ سلطان کے انتقال کے بعد لکھا ہے۔ اب سلطان دنیا میں نہ تھا اور مناسب یہی تھا کہ بحکم اذکروا موتاکم بالخیر اس کی کوتاہیاں بھلا کر اس کی آخری عہد کی فیاضیوں کو سراہا جائے، چنانچہ اب البیرونی اس کی سرپرستیوں کا اعتراف کرتا ہے اور اسکی ابتدائی مخالفانہ روش کو یاد رکھنا نہیں چاہتا۔

علاوہ بریں معاملے کا یہ پہلو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس زمانے میں البیرونی نے یہ قصیدہ لکھا ہے اُس وقت سلطان محمود کا لڑکا سلطان مسعود حکمران تھا اور اسکی فیاضیانہ سرپرستیاں البیرونی کو حاصل ہو گئی تھیں۔ البیرونی اس کی فیاضیوں سے اس درجہ متاثر ہوا تھا کہ اس نے اپنی سب سے زیادہ اہم تصنیف اسی کے نام سے لکھی تھی یعنی القانون المسعودی۔ ایسی حالت میں یقیناً وقت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ اپنے فیاض سرپرست اور قدر شناس بادشاہ کے باپ کا ذکر حتی الامکان اچھے لفظوں میں کرے اور اس عہد کی ناگوار باتوں کی تلخیاں بھلا دے۔

Marfat.com

ہندوستان میں البیرونی کی حدودِ سیاحت

ڈاکٹر اڈورڈ زخاؤ (سخاؤ) نے کتاب الہند کی ایک تصریح سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ البیرونی کی حدودِ سیاحت ہندوستان میں ملتان اور لاہور سے آگے نہیں بڑھی تھی، چنانچہ اس وقت سے یہ بات بطور ایک مسلمہ واقعہ کے تسلیم کر لی گئی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ البیرونی نے ہندوستان میں سے صرف ملتان اور لاہور کو دیکھا تھا۔

لیکن ۱۹۰۶ء میں جب مجھے القانون المسعودی کے نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ کے مطالعہ کا موقعہ ملا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ رائے نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔ اب تو گان آفندی کے اس مجموعہ کے مطالعہ کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ البیرونی کی سیاحت ہند کا دایرہ صرف پنجاب ہی میں محدود نہ تھا۔

البیرونی ایک خاص رصدی عمل کا ذکر کرتے ہوئے القانون میں لکھتا ہے کہ جب میں ہندوستان میں تھا تو ایک ایسے مقام پر جو سمندر کے کنارے ہے مجھے اس عمل کے انجام دینے کا موقع ملا۔ سوال یہ ہے کہ اگر البیرونی کی سیاحت ہند صرف پنجاب کے ایک حصہ ہی تک محدود رہی تھی تو یہ ساحلی مقام کونسا تھا؟ ظاہر ہے کہ پنجاب میں نہیں ہو سکتا۔ سمندر ہندوستان میں یا تو جنوب کی طرف مل سکتا ہے یا پچھم کی طرف۔ البیرونی کا ہندوستان کا جنوبی حصہ تک پہنچنا بہت دشوار تھا اور اس کی تمام تصریحات اتنے وسیع اور طولانی دایرہ سیاحت کے قطعاً خلاف ہیں، پس صرف پچھم کا ساحلی حصہ رہ جاتا ہے جہاں وہ پہنچ سکتا تھا اور قیاس چاہتا ہے کہ یہ سندھ کا علاقہ ہوگا۔

ویسے بھی یہ بات بہت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ البیرونی پنجاب آیا ہو اور اس نے سندھ کی سیاحت کا قصد نہ کیا ہو۔ محمد بن قاسم کے عہد سے اسلامی حکومت بلا انقطاع سندھ میں قایم رہی اور اس زمانہ میں وہ بھی پنجاب کی طرح سلطان محمود کے زیرِ حکومت آچکا تھا۔ پس کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ البیرونی نے سندھ کی سیاحت نہ کی ہو۔ القانون کی مندرجۂ صدر تصریح نے اس قیاس کی پوری طرح تصدیق کر دی، کیونکہ ایسی جگہ جو سمندر کے ساحل پر ہو اُسے سندھ ہی میں مل سکتی تھی۔ اب البیرونی کی کتاب الصیدنہ کے اقتباسات سے جو اس مجموعہ میں شامل کیے گئے ہیں اس خیال کی مزید تصدیق ہو گئی وہ

"جرجیز" کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ملتان اور سندھ کے درمیان جو جنگل واقع ہیں، ان میں میں نے دیکھا کہ دو طرح کی بوٹیاں اس چیز کی پیدا ہوتی ہیں" پھر ان دونوں قسموں کی پیدائش کی خصوصیات بیان کی ہے۔ (صفحۃ المعمورہ، ۱۱۶)

پھر اسی کتاب میں سیب کے اقسام پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"میں نے کشمیر کے پہاڑوں میں ایک قسم کا سیب دیکھا جو قسم اہلی سے مختلف نہیں ہے، البتہ اس کے درخت میں کانٹے بہت زیادہ ہوتے ہیں" (ایضاً۔ صفحہ ۱۱۴)

کتاب الصیدنہ کی ان دونوں تصریحوں کو جب ہم القانون کی تصریح کے ساتھ جمع کرتے ہیں تو البیرونی کی حدود سیاحت کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ سندھ، پنجاب اور کشمیر، ان تینوں علاقوں میں اُسے سیاحت کا موقع ملا تھا، غالباً وہ غزنی سے کابل گیا، کابل سے پرشاور (پشاور حالی)، میں آیا اور لاہور اور کوہستان کشمیر کی سیاحت کی، پھر ملتان گیا اور غالباً اس کی تحصیل سنسکرت و تحقیقات ہند کا بڑا زمانہ وہیں بسر ہوا۔ پھر ملتان سے سندھ گیا اور سندھ سے غزنی۔

سلطان محمود کا قبضہ خوارزم پر ۴۰۸ھ میں ہوا اور اسی سنہ میں البیرونی غزنی پہنچا۔ تحدید نہایات الاماکن کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنہ کے ایک برس بعد یعنی ۴۰۹ھ میں وہ کابل کے قریب ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ اسی طرح القانون کے ایک مقام سے جہاں اس نے غزنی کے طول بلد کی تصحیح کی ہے، ۴۱۰ھ میں اس کا غزنی میں ہونا ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ پس ڈاکٹر زخاؤ (سخاؤ) کے اس قیاس کی اب مزید تصدیق ہو گئی کہ اس کی سیاحت ہند کا زمانہ ۴۱۰ھ کے بعد شروع ہوا اور غالباً نو دس برس تک جاری رہا۔

البیرونی کی دماغی سیرت

البیرونی کی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا بے لاگ علمی یعنی سائنٹیفک دماغ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہر جگہ اس کے ساتھ آتی ہے۔ کوئی دینی عقیدہ، کوئی قومی روایت، کوئی تاریخی مسلمہ اس کی اس خصوصیت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقلیت بے لچک، بے داغ اور ناممکن التسخیر ہے۔

الآثار الباقیہ اور کتاب الہند میں اسکی یہ خصوصیت جا بجا نمایاں ہوئی ہے اور اہل علم کی بحث و نظر میں آچکی ہے۔ ہم یہاں ان مباحث کو دہرانا نہیں چاہتے۔ البتہ کتاب الصیدنہ اور الجماہر کے مطالعہ سے جو بعض نئے شواہد روشنی میں آئے ہیں ضروری ہے کہ ان پر نظر ڈال جائے۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے تمام عرب مورخوں اور سیاحوں نے سنگل دیپ یعنی سیلون (سیلان) کی معدن یاقوت کا ذکر کیا ہے نیز ایک پہاڑ کا جسے وہ "جبل البرق" کے نام سے موسوم کرتے تھے یعنی بجلیاں چمکانے والا پہاڑ۔ ان دو باتوں نے جمع ہو کر طرح طرح کے وہمی قصے مشہور کر دیے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان قصوں کا سرچشمہ مغربی ہندوستان کے ساحلی مقامات تھے جہاں عراق اور مصر کے عرب جہاز راں آتے رہتے تھے۔ ازانجملہ ایک روایت یہ تھی کہ وہاں راون کا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر ہمیشہ بجلی چمکتی رہتی ہے اور یہی بجلی ہے جس کے اثر سے یاقوت بنتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ "راون" سے مقصود ہندوستان کے مشہور اسطورہ راماینا کا وہ عفریت ہے جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ سیلان کا بادشاہ تھا۔ عربوں نے "راون" کو راہون بنا دیا اور "جبل الراہون" کے افسانے عربی تاریخوں میں سرایت کر گئے۔ چنانچہ المسعودی، ابن حوقل، المقدسی اور نصر بن احمد الخطیبی وغیرہم سب نے "جبل الراہون" کا ذکر کیا ہے اور طرح طرح کے عجائب و خوارق اس کی طرف منسوب کر دیے ہیں۔ الجماہر میں البیرونی ان افسانوں کو نقل کر کے پہلے "جبل البرق" کی یہ توجیہہ کرتا ہے کہ وہ غالباً آتش فشاں پہاڑ ہوگا جس کی چوٹی پر آگ کے شعلوں سے بجلی کی سی چمک درخشاں ہوتی رہتی ہے، پھر لکھتا ہے کہ "ھٰذا من اشباہ الخرافات التی ساحکی بعضہا عن الفرس" (صفۃ المعمورۃ، صفحہ ۷۰) یعنی یہ قصے خرافات کی طرح ہیں، جیسے کہ ایرانیوں میں بھی مشہور ہو گئے تھے اور جن میں سے بعض قصے میں آئندہ بیان کروں گا۔

اس طرح کبریت الاحمر یعنی سرخ گندھک کے عجیب و غریب خواص لوگوں میں مشہور ہو گئے تھے اور خواص الاشیاء کی طبی کتابوں میں بھی انھوں نے جگہ پائی تھی۔ ایرانیوں میں مشہور تھا کہ کوہ دنباوند میں اس کی کان ہے۔ البیرونی ان تمام قصوں کی ہنسی اُڑاتا ہے اور انھیں یک قلم بے اصل قرار دیتا ہے۔ (ایضاً، صفحہ ۷۶)[1]

الجیہانی کی کتاب المسالک والممالک چوتھی صدی ہجری کے بعد کے مصنفوں کا ایک بڑا ماخذ ہے۔ خود البیرونی نے جا بجا اس کے حوالے دیے ہیں۔ اس نے روم کے کنیسہ اصطفانوس (Santo Stefano) کا حال لکھتے ہوئے طرح طرح کی دور از عقل روایتیں درج کر دی تھیں جو بعد کی کتابوں میں بھی برابر نقل ہوتی رہیں۔ مثلاً کنیسہ کے ایک ہزار دروازے ہیں اور بیس ہاتھ لمبی زمرد کی قربان گاہ ہے۔ البیرونی ان روایتوں کو نقل کر کے ان کی سخافت پر ہنستا ہے اور لکھتا ہے: "لو صدرت ھذہ الحکایة عن ارض فارس، لقلت ان ما کان فی الکنز المحترق من الزمرد قد انسبک فکان منه ذلک المذبح"۔ یعنی اگر اس طرح کا قصہ سرزمین فارس سے تعلق رکھتا تو میں یہ کہہ کر اس کی توجیہ کر لیتا کہ سکندر کے قبضۂ فارس کے وقت جو آگ لگی تھی اس کی وجہ سے خزانہ کے تمام زمرد پگھل گئے اور ان سے یہ قربان گاہ ڈھال لی گئی اگرچہ پھر بھی اس مشکل کا حل نکالنا دشوار ہوتا کہ آگ اور زمرد میں باہم دوستی نہیں۔ الجیہانی نے کنیسہ کے جو ایک ہزار دروازے گنوائے ہیں اس کی نسبت کہتا ہے: "فانه یقتضی عدم حائط لها وانما یحیط لها ابواب متلاصقة"۔ (ایضاً، صفحہ ۸۰)[2] یعنی اگر یہ کہانی صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ کنیسہ کا حصار دیوار کی جگہ صرف دروازوں سے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے بنتے چلے گئے ہیں اور در دیوار کوئی نہیں ہے۔

وسط ایشیا اور ایران کی قدیم وہم پرستیوں میں سے ایک وہم پرستی "سنگ یدہ" کے بارے میں تھی۔ "سنگ یدہ" سے مقصود ایک خاص طرح کا پتھر تھا جس کی نسبت یقین کیا جاتا تھا کہ اس میں برسات برسا دینے کا معجزانہ خاصہ ہے۔ چنانچہ یہ خیال فارسی شاعری میں بھی سرایت کر گیا۔ رضی دانش کہتا ہے:

باعث ریزش باران سرشکم شدہ است
دل سنگین تو سنگ یدہ را می ماند

یعنی معشوق کا دل پتھر ہے لیکن وہ پتھر سنگ یدہ کا پتھر ہے کیونکہ اس کی تاثیر

۱۔ یعنی صفة المعمورہ، صفحہ ۷۶ ۲۔ یعنی صفة المعمورہ، صفحہ ۸۰

سے میری آنکھوں سے برسات کی طرح آنسوؤں کی جھڑی برستی رہتی ہے۔ اور مرزا محسن تاثیر نے کہا ہے: "سنگ دل خوباں ہمہ سنگ یدہ باشد" اور شاعر ہند شیخ ابراہیم ذوق نے کہا ہے: یہ آیا جوش میں باران رحمت باری
کہ سنگ سنگ میں سنگ یدہ کی ہے تاثیر

تاریخ ہند کے بعض واقعات سے بھی اس وہم پرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ رائے آنند رام مخلص نے اپنی کتاب مراۃ الاصطلاحات میں لکھا ہے کہ سیف الدولہ دلیر جنگ ناظم ملتان کے عہد میں ایک ترک آیا تھا جسکے پاس یہ پتھر تھا، وہ یہ پتھر منہ میں رکھ کر آسمان کے نیچے کھڑا ہوجاتا تو بارش ہونے لگتی۔ محمد شاہ شہنشاہ ہند کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے اس ترک کو دارالحکومت دہلی میں طلب کیا لیکن قبل اس کے کہ شاہی حکم ملتان پہنچے وہ وہاں سے غائب ہوچکا تھا۔

البیرونی الجماہر میں "العجائب للمطر" کے عنوان سے لکھتا ہے:۔

"ابن زکریا الرازی نے کتاب الخواص میں ذکر کیا ہے کہ ترکستان میں خرنیخ اور تیج ناک کے درمیان ایک گھاٹی ہے جسکے پتھروں میں یہ خاصیت ہے کہ اگر فوج یا جانوروں کا ریوڑ وہاں سے غفلت میں گزر جائے اور ان کے قدموں کی تیزی اور شدت سے رگڑ پیدا ہونے لگے تو فوراً بادل چھا جاتا ہے اور شدت سے پانی برسنے لگتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی گروہ وہاں سے گزرتا ہے تو اپنے جوتوں پر صوف کے غلاف چڑھا لیتا ہے تاکہ رگڑ پیدا نہ ہو۔ اس کے بعد الرازی کہتا ہے کہ اس گھاٹی کے پتھروں کو لوگ اس غرض سے کام میں لاتے ہیں کہ جب چاہیں برسات برسادیں۔ چنانچہ طریقہ اس کا یہ ہے کہ ایک آدمی یہ پتھر لیکر پانی میں اتر جاتا ہے اور پھر اسے اپنے منہ میں رکھ کر باتیں بلانے لگتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد اسکی تاثیر اپنا عمل دکھاتی ہے اور برسات برسنے لگتی ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے کہ یہ حکایت صرف الرازی ہی نے نہیں لکھی ہے بلکہ عام طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ عقیدہ اس طرح پھیل گیا ہے گویا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب کتاب المنتخب نے بھی برسات لانے والے پتھر کا ذکر کیا ہے۔" پھر اس کے بعد لکھتا ہے:۔

"ایک ترک میرے پاس یہ پتھر لایا تھا اور اس کا گمان تھا کہ میں اسے دیکھ کر خوش ہوں گا اور اس کے خاصہ کے بارے میں رد و کد نہیں کروں گا۔ لیکن میں نے اس سے کہا کہ مجھے تجربہ کرکے دکھلائے، اگر تجربہ سے اس کا خاصہ ثابت

Marfat.com

ہو گیا تو جو کچھ وہ مانگتا ہے اس سے زیادہ اسے صلہ دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ پانی میں اتر کر کھڑا ہو گیا اور پتھر منہ میں رکھ کر دیر تک شور و غل مچاتا رہا لیکن نہ تو بادل چھایا نہ ایک قطرہ پانی برسا۔"

فرنچ سیاح برنیر نے بھی جس نے شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اپنے سفر کشمیر کا حال لکھتے ہوئے ایک ایسے ہی عقیدے کا ذکر کیا ہے جو کشمیریوں میں پایا جاتا ہے، وہ لکھتا ہے جب ہم "پیر پنجال" کی چوٹی پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک درویش کھڑا ہے اور اشارہ کر رہا ہے کہ خاموش گزر جاؤ، اگر شور و غل ہوا تو سخت طوفان آجائے گا۔

اسی طرح کا وہم پرستانہ اعتقاد بعض چشموں کی نسبت بھی لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا خیال کیا جاتا تھا کہ اگر ان چشموں میں کسی طرح کی گندگی پھینکدی جائے گی تو برسات برسنے لگے لگی یا ژالہ باری شروع ہو جائے گی۔ البیرونی اس وہم پرستی کی حکایتیں نقل کر کے لکھتا ہے:

"کئی بار فوج کے ساتھ میں اسی طرح کے ایک مقام پر سے گزرا۔ فوج میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو نہایت گندے تھے اور ہر طرح کی گندگیاں چشمے میں ڈالتے تھے تاہم کبھی ایسا نہ ہوا کہ ابر و باد کا کوئی حادثہ نمودار ہوا ہو۔"

(صفۃ المعمورہ، صفحہ ۹۰)

فولاد اور اس کے اقسام پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:

"فولاد کے بارے میں ایک کہانی بیان کی جاتی ہے اور اگرچہ کثرت کے ساتھ تاریخ کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے لیکن خرافات میں داخل ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب قندھار فتح ہوا تو وہاں فولاد کی ایک لاٹ ملی جو ستر ہاتھ لمبی تھی اور جب ہشام بن عمرو نے اس کے نیچے کی زمین کھدوا ڈالی تو معلوم ہوا کہ تیس ہاتھ کے قریب اس کا نچلا حصہ زمین کے اندر تھا۔ پھر جب اُس لاٹ کی حقیقت دریافت کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ ملوک تبع یمن کی یادگار ہے۔ وہ ایرانیوں کے ساتھ یہاں آئے تھے اور جب ہندوستان پر قابض ہو گئے تو انھوں نے اپنی تلواریں پگھلا کر یہ لاٹ تیار کرائی۔"

پھر اس حکایت کی ہنسی اڑاتا ہے اور کہتا ہے یہ بات کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے کہ ایک بادشاہ اپنی فوج کو اسلحہ سے محروم کر دے اور ان سے ایک یادگاری لاٹ تیار کرائے؟

یہ حکایت اگر اصلیت سے خالی نہیں ہے تو یقیناً یہ لاٹ راجہ اشوک کی لاٹوں میں سے ہو گی جو اُس نے اپنے فرامین کندہ کرنے کے لیے ممالک محروسہ کے مختلف حصّوں میں نصب کرائی تھیں۔ ہندوستان میں ایسی چار لاٹیں اب بھی موجود ہیں اور دو خود دہلی میں ہیں البتہ ان کا طول جو سو ہاتھ کا بیان کیا گیا ہے، یہ یقیناً مبالغہ ہے۔

دوسروں کی علمی تحقیقات قبول کرنے میں البیرونی نہایت محتاط ہے۔ عام شہرت اور مسلّمہ ثقاہت اس کے لیے کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اگر خود اس کے مقررہ معیار پر ایک شخص پورا نہیں اُترتا تو محض شہرت کی بنا پر وہ اس کی تحقیقات کو پرکاہ برابر بھی اہمیت نہیں دیگا اور ایک عالم محقق کی یہی شان ہونی چاہیے۔ جرجان کے طول بلد کی نسبت اس کے معاصر الشیخ ابن سینا نے اپنے رصدی عمل کی جو تفصیلات لکھی تھیں وہ اسے مطمئن نہ کر سکیں، چنانچہ اس بارے میں اس کی رائے گزر چکی ہے، یہاں ہم ایک دوسرے معاملہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ تحدید نہایات الاماکن میں اُس نے بلخ کے طول بلد پر بحث کرتے ہوئے منصور بن طلحہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی فضیلت علمی کا ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے... "ھذا الرجل الفاضل کان بقیۃ الولاۃ الطاھریۃ بخراسان و ذا حظ من علوم الریاضیات وما حولھا" یعنی یہ فاضل آدمی خراسان کے والیانِ طاہری کا بقیہ تھا اور علوم ریاضی اور اس کے متعلقہ فنون میں مہارت رکھتا تھا لیکن پھر آگے چل کر جہاں اس کے رصدی عمل کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے فیصلوں کے ماننے میں متامل نظر آتا ہے کیونکہ اُسے معلوم ہو چکا ہے کہ اس شخص کی اصلی علمی جگہ طبیعات میں تھی، ریاضیات میں نہ تھی۔ اگرچہ ریاضیات میں بھی مہارت رکھتا تھا اور پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ نجوم کے فن سے بھی اُسے دلچسپی تھی اور جو شخص نجوم کا معتقد ہو اس کا دماغ علوم فلکیہ کے اعمال و احکام میں بے داغ علمی دماغ نہیں ہو سکتا، چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"وممکن ان یکون منصور بن طلحۃ صحح ذالک اعتباراً لارصداً بحسب ما امکنہ لحاجتہ الی تقویم الکواکب فقد کان مولعا بعلم النجوم.... ومنصور علی کثرۃ فضائلہ اثبت قدماً فی الطبیعیات واحکام النجوم منہ فی الریاضیات ولیس من علم الھیئۃ بمتمکن بحیث یقلد وان کان ثقۃ" (صفۃ المعمورہ ص۶۷)

صرف یہی ایک مثال اس کے لیے کافی ہے کہ البیرونی کا دماغ اپنے علمی فیصلوں میں کس درجہ محتاط تھا اور کس طرح ہر معاملے کو بے لاگ علمی اور خالص عقلی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔

Marfat.com

الصیدنہ اور الجماہر

الصیدنہ مفرد دواؤں کی تحقیقات میں ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اور الجماہر جواہرات کی تحقیقات میں ہے۔ ان دونوں رسالوں میں البیرونی کا حکیمانہ دماغ ہر جگہ اپنی پوری نمود رکھتا ہے۔ مطالعۂ اشیاء میں ایک سچے حکیم کی طرح اس کی نگاہ نہایت متجسس اور حقیقت طلب تھی۔ وہ ہر چیز کی جانچ پڑتال کرنی چاہتا تھا اور ہر اظہار اور ہر نمود کو علم و تجربہ کی کسوٹی پر کسنا چاہتا تھا۔ عوام کا کوئی اعتقاد، خواص کی کوئی روایت سیاحوں کا کوئی مزعومہ مشاہدہ، مستند کتابوں کا کوئی بیان اس کے لیے دلیل وحجت نہیں ہو سکتی۔ دلیل وحجت صرف علمی تجربہ اور عقلی تصدیق ہے

اس زمانے میں جڑی بوٹیوں اور قیمتی پتھروں کی نوعیت اور خواص کے بارے میں طرح طرح کی دور از کار باتیں عام طور پر مشہور ہو گئی تھیں، نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی انھیں تسلیم کرتے تھے اور فن کی کتابوں میں انھیں جگہ دیتے تھے لیکن البیرونی ان تمام باتوں کو بلا تامل بے اصل کہہ دیتا ہے اور جا بجا اپنا ذاتی علم و تجربہ پیش کرتا ہے۔ مومیائی کے خاصے کی نسبت جو بے اصل روایت مشہور ہو گئی تھی اُس کی بازگشت آج تک ہمارے فن طب میں سنائی دے رہی ہے۔ عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑ دینے میں اس کا اثر بے خطا ہے۔ حتیٰ کہ اگر بچھو کی ڈانگ توڑ کر مومیائی باندھ دی جائے تو تھوڑی دیر کے بعد وہ دوڑنے لگے گی۔ البیرونی کو اس خاصے کے تسلیم کرنے میں تامل ہے اور وہ اس کے خلاف خود اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے۔ اسی طرح "فاذزہر" کے بارے میں بھی اس نے اپنے ایسے ہی خیالات ظاہر کیے ہیں۔

معدنیات کی نسبت اس کی تحقیق نہایت قیمتی اور دلچسپی تلی ہے۔ فولاد کی نوعیت اور اس کے اقسام پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور نرم آہن کے اقسام واضح کیے ہیں۔ جس سے اعلیٰ درجہ کی تلواریں اور خنجر تیار کیے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کی صناعی تمام ملکوں سے بازی لے گئی ہے۔

Marfat.com

ہندوستان اور حکیم ابوریحان بیرونی

کتاب الہند : مستشرقین یورپ کی کوششوں سے ابوالریحان محمد بن احمد البیرونی کی شہرۂ آفاق کتاب "کتاب الہند"، یا "تحقیق ماللہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل ادمرذولۃ" ۱۸۸۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ بیرونی پانچویں صدی ہجری کا مشہور حکیم اور محقق ہے۔ گیارھویں صدی مسیحی کے اوایل یعنی اب سے نوسو برس پہلے اس نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ یہ زمانہ سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کا تھا۔ محمد بن القاسم کی فتح سندھ کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمان بہ حیثیت جماعت اندرون ہند میں بڑھے۔ مسلمان، یہاں کے باشندوں سے ناواقف تھے، اور ہندو، مسلمانوں سے ناآشنا۔ بیرونی ہندوستان میں بطور سیاح کے داخل ہوا۔ سنسکرت زبان حاصل کی۔ ہندو علماء کی صحبت میں بیٹھا۔ ہندو علوم کی تحصیل کی، ان کے حالات سے واقف ہوا۔ اور پھر غزنی میں بیٹھ کر اپنی یہ جلیل القدر کتاب مرتب کی۔ اس کتاب کے متعلق بالاتفاق تمام محققین حال کا فیصلہ ہے کہ اُس عہد کے ہندوستان پر اس سے بہتر اور محققانہ بیان کسی مصنف کا موجود نہیں۔ یہ کتاب ہمارے سامنے نوصدی پہلے کا ہندوستان پیش کرتی ہے۔ اس میں زیادہ تر بحث ہندو فلسفہ، الہیات، نجوم، ریاضی وغیرہ علوم سے کی ہے۔ لیکن ضمناً اُس وقت کی معاشرتی حالت پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ہم اس کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ان سے قارئین الہلال اندازہ کر سکیں گے کہ قدیم ہندوستان کی معاشرتی ذہنیت کا کیا حال تھا، اور اس طویل مدت میں کتنا کم تغیر اُس میں واقع ہوا ہے؟ غالباً کسی ملک کے ذہنی اور معاشرتی جمود و تصلب کی اس سے بہتر مثال دنیا میں موجود نہیں۔

ہندوستان کے سمجھنے میں دشواریاں بیرونی نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں وہ دشواریاں بیان کی ہیں جو غیر قوموں کو ہندوستان کے سمجھنے میں پیش آتی تھیں، وہ لکھتا ہے:

"ہندوستانی ہم سے اُن تمام باتوں میں مختلف ہیں جو قوموں میں اشتراک یا تعارف کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ زبان اگرچہ سب قوموں کی زبانیں الگ الگ اور مختلف ہیں لیکن ہندوستان کی زبان (سنسکرت) عربی کی طرح بہت ہی وسیع و دقیق ہے۔ اجنبی کے لیے اس کی تحصیل، عربی سے بدرجہا زیادہ دشوار ہے۔ اس زبان میں ایک ہی چیز کے بہت سے نام اور ایک ہی لفظ کے بہت سے معنی

Marfat.com

پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا احاطہ و ادراک اِس قدر مشکل ہے کہ اسماء و مسمیات کی تمیز بجز خاص ذہانت و قابلیت رکھنے والوں کے، عام لوگوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ ہندو اپنی زبان کی اس پیچیدگی پر اُسی طرح ناز کرتے ہیں جس طرح بعض دوسری قومیں کرتی ہیں، حالانکہ یہ درحقیقت زبان کا عیب ہے۔ نہ کہ خوبی۔

ہندوستان کی زبان کی دو قسمیں ہیں، عامی اور فصیح۔ عامی عوام اور بازاریوں کے استعمال کے لیے ہے۔ فصیح، علم و ادب اور مجالسِ سلاطین و حکماء کے لیے۔ یہ اپنے اشتقاق، تصریف، نحو کے دقایق، اور بلاغت کی باریکیوں کی وجہ سے اس قدر مغلق ہے کہ ماہر علماء کے سوا اس سے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتا۔

پھر یہ زبان ایسے حروف سے مرکب ہے جن میں سے بعض حروف عربی اور فارسی حروف سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری زبانیں اور حلق ان کے صحیح تلفظ کی قدرت ہی نہیں رکھتے۔ یہی باعث ہے کہ عربی خطیں ان کی تحریر ناممکن ہے، اگرچہ نقطوں، علامتوں اور اعراب سے انہیں کتنا ہی مقید کر دیا جائے۔

پھر بعض حروف مستعمل ہیں، بعض متروک۔ ساتھ ہی نقل و صحت کا بھی اُن کے ہاں زیادہ اہتمام نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب ایک دو نقلوں کے بعد برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی زبان ایک نئی زبان بن جاتی ہے۔ عوام کی خواص بھی اُسے سمجھ نہیں سکتے۔ خود میرا تجربہ ہے کہ میں نے اُنھی کے منہ سے کوئی لفظ سنا، پھر مزید تاکید و تصحیح کے خیال سے اُن کے سامنے دہرایا تو میں نے دیکھا، خود ان کے لیے اُس کا دوبارہ سمجھنا دشوار ہو گیا تھا!

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بعض دوسری عجمی زبانوں کی طرح ان کی زبان میں بھی دو تین ساکن حرف ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں، اور اکثر الفاظ میں ابتدا بہ سکون ہے۔ ہماری زبانیں اس قسم کے الفاظ بولنے کی عادی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اکثر الفاظ ہم آسانی سے بول نہیں سکتے۔

۲۔ دینی اختلاف: باشندگانِ ہند ہم سے دین میں بھی کلی اختلاف رکھتے ہیں۔ نہ اُن کا کوئی عقیدہ ہمارے لیے قابلِ تسلیم ہے، نہ ہمارا کوئی عقیدہ ان کے لیے قابلِ قبول۔ وہ آپس میں بھی مذہبی اختلاف رکھتے ہیں۔ مگر یہ اختلاف فروعی ہیں دوسری قوموں سے ان کا اختلاف اصولی ہے۔ وہ سب قوموں کو "ملیچھ" (ملیچھ) یعنی ناپاک کے لقب سے پکارتے ہیں اور ان سے ملنا جلنا

ناجائز سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُس پانی اور آگ کو بھی ناپاک سمجھتے ہیں جو کسی غیر باشندہ ہند کے استعمال میں آگئی ہو!

پھر اُن کے خیال میں یہ نجاست اس درجہ شدید ہے کہ پاکی کی کوئی صورت بھی ممکن نہیں۔ یہ کسی حال میں بھی جائز نہیں کہ غیر ہندو اگر چہ ہندو مذہب کا کتنا ہی قایل ہو جائے، ان میں داخل ہو سکے، یا جو آدمی اُن کے دین سے ایک مرتبہ نکل گیا ہے، وہ پھر اُس میں لوٹ سکے۔ اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے، کہ وہ تمام دنیا سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ کوئی بندھن بھی ہمیں اور اُنہیں جوڑنے والا موجود نہیں۔

۳۔ رسوم و عادات | یہ مغایرت اس درجہ شدید ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہم سے، ہمارے لباس سے، ہماری وضع قطع سے ڈرایا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں شیطنت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ہم سے نفرت ان کے دلوں میں اس قدر راسخ ہے کہ خود میں نے اپنے کانوں سے انہیں کہتے سنا، تمہاری سرزمین کے ایک بادشاہ نے آکر ہمارا ایک بادشاہ مار ڈالا تھا۔ مقتول اپنے پیچھے ایک شیر خوار بچہ چھوڑ گیا۔ جب بچہ جوان ہوا اور اپنی ماں سے اپنے باپ کا حال سنا تو سخت غضب ناک ہوا تمہارے ملک پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے بے حساب مخلوق قتل کی۔ جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے مغلوبوں کو اس وضع کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جو آج کل تمہاری وضع ہے!" راوی کا اس قصہ سے مقصود یہ تھا کہ ہماری وضع ذلت کی وضع ہے، اور اُنہی کے ایک بادشاہ نے ہمیں اس کے اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے! میں نے یہ افسانہ سُن کر ان کے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا کہ معاملہ اتنے ہی پر ختم ہو گیا اور اس "فاتح" نے ہمیں ہندو بننے اور ہندو رسم و رواج اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا!

۴۔ مسلمانوں کا حملہ | منافرت کی بڑی وجہ، ہندوستان پر مسلمانوں کا حملہ ہے۔ یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی کی جنگوں نے انہیں بہت ہی سخت نقصان پہنچایا۔ اُن کی آبادیاں برباد ہو گئیں۔ انہیں منتشر و پراگندہ کر دیا گیا۔ اُن کی صرف سلطنت ہی نہیں گئی، بلکہ مفتوحہ علاقوں سے ان کے علوم و فنون بھی مٹ گئے، اور ایسے دور دراز خطوں میں جلاوطن ہو گئے، جہاں تک رسائی مشکل ہے۔ مثلاً کشمیر اور بانارسی (بنارس) وغیرہ (بنارس کو دور اس لیے کہا ہے کہ یہ پنجاب اور وسط ہند سے دور، مشرق کی طرف ہٹا ہوا ہے)

یہی دینی اور سیاسی اسباب ہیں جن کی بنا پر ہندوؤں میں مسلمانوں اور تمام اجنبیوں سے سخت نفرت و عداوت پیدا ہو گئی ہے۔

۵۔ تنگ نظری | پھر اُن کے اخلاق میں ایک اور بات بھی راسخ ہوگئی ہے۔ اور کسی طرح نکل نہیں سکتی۔ یہ اُن کے انتہائی علمی و ذہنی تنزل کا نتیجہ ہے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ دنیا صرف اُنہی کی دنیا ہے۔ انسان صرف اُنہی کی سرزمین پر موجود ہیں۔ بادشاہ صرف اُنہی کے بادشاہ ہیں۔ دین صرف اُنہی کا دین ہے اور علم صرف اُنہی کا علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت مغرور اور برخود غلط ہوگئے ہیں۔ اگر ان سے علماء عرب و عجم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو مخاطب کو جاہل خیال کرتے اور اُس کی تصدیق پر ہرگز آمادہ نہیں ہوتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ سیر و سیاحت کے عادی ہوتے اور اپنے پہاڑی حدود طے کر کے غیر قوموں سے ملتے، تو یہ جاہلانہ و طفلانہ خیال ان میں پیدا نہ ہوتا۔

لیکن یاد رہے کہ اُن کے پیش روؤں کا یہ حال نہ تھا۔ ان کا مشہور فاضل البیرونی برہمنوں کی تعظیم کے بیان میں کہتا ہے، "جب یونانیوں نے باوجود ناپاک ہونے کے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور سب پر بازی لے گئے، تو اُن کی بھی تعظیم واجب ہوگئی۔ ان کا درجہ بھی برہمن کا درجہ ہوگیا"!

خود میری حالت یہ ہوئی کہ مدت تک ان کے منجموں کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرتا رہا۔ کیونکہ میں اُن کی زبان اور اُن کے طریقوں سے بے خبر تھا۔ لیکن جب کچھ اُن کی زبان میں دخل پیدا ہوگیا تو میں انھیں اپنے یہاں کے علوم کی بنا پر اشیاء کی علتوں اور حساب و ریاضی کے براہین سمجھانے لگا۔ اس پر وہ سخت متعجب ہوئے اور استفادہ میں باہم پیش قدمی کرنے لگے۔ بڑی حیرت سے پوچھتے تھے: "ہندوستان کے کن کن علماء کو تم نے دیکھا ہے؟ کن کن سے فایدہ اٹھایا ہے؟"۔ کیونکہ اُن کے خیال میں علم، ہندوستان کے سوا کہیں ہے ہی نہیں۔ جب میں نے اُن سے کہا کہ میں پہلی مرتبہ اُن سے ملا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں، یہ دنیا کے دوسرے حصوں کے علوم ہیں، تو وہ اور زیادہ متعجب ہوئے، اور بعض نے تو مجھے جادوگر سمجھنا شروع کر دیا"۔[1]

---

[1] منقول از الہلال کلکتہ، ۲۶ اگست ۱۹۲۷ء، ص ۱۰، ۱۱

Marfat.com

کتاب الہند

ہندوستان کے فنون لطیفہ اور عرب یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندوستان کے تمام علوم و فنون میں دلچسپی لی، لیکن ہندوستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابو ریحان البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم و عقاید پر نظر ڈالی ہے اور ایک باب "فی کتبھم فی سائر العلوم" پر بھی لکھا ہے، مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ نے "الآثار الباقیہ" کے مقدمے میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے، جس میں اس نے اپنی تمام مصنفات کا بہ تفصیل ذکر کیا تھا، مگر اس میں بھی اس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی، حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے نائک سلطان محمود اور سلطان مسعود کے درباروں میں اپنے کمالات فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے اور ہندوستان کے ڈھول اور باجے غزنین کے گلی اور کوچوں میں بجائے جا رہے تھے۔ غالباً اس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علوم عقلیہ کے شوق و اشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرتے اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندوستان کے ذوقِ سماع سے اس درجے مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بمشکل آشنا ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندوستان کے ڈراموں سے بھی عرب مصنف یک قلم ناآشنا رہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فن عروض کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے، لیکن ناٹک کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

راگ کے ذریعے شکار کا طریقہ ہندوستان کے قدمائے فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے۔ جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کر کے رام کرنے میں خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہے۔ اکبر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکار قمرغہ کے سر و سامان میں داخل ہوتی اور اس کے طائفے باکمالانِ فن کی نگرانی میں تیار کرائے گئے۔ آنند رام مخلص نے "مراۃ المصطلحات" میں اس طریق شکار کی بعض دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے جب شکار قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا، تو یہ طائفے شکار گاہ میں بھیج دیے جاتے اور رقص و سرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص و سرود کی محویت انہیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکار قمرغہ کا اہتمام کیا اور اسی رقص و سرود کا جال پھیلایا۔ جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے تو نور جہاں کی زبان

پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہو گیا۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف

بہ امید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ شعر سن کر جہانگیر کی غیرتِ مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لیے ہاتھ اٹھائے، دل گرفتہ واپس آگیا۔

یہ خیال کہ جانور گانے سے متاثر ہوتے ہیں دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ توراۃ میں ہے کہ حضرت داؤدؑ کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدمائے فن نے تو اسے ایک مسلمہ حقیقت مان کر اپنے بے شمار عملیات کی بنیاد بھی اسی عقیدے پر استوار کی تھیں۔ سانپ، گھوڑے اور اونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے حدی کی لے اگر رک جاتی ہے تو محمل کی تیز رفتاری بھی رک جاتی ہے؛

۱ حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

البیرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو تو اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے وہ صید کو جس طرف لے جانا چاہے صرف اپنے راگ کے زور سے لگاتے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے، جانوروں کی اس محویت و تسخیر کو عوام تعویذ اور گنڈے کا اثر سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ محض گانے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں جہاں جزیرہ سراندیپ کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے یہاں بندر رہتے ہیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مسافر ان کے غول میں پھنس جائے اور رامائن کے وہ اشعار جو ہنومان کی مدح میں لکھے گئے ہیں پڑھنے لگے تو بندر اس کے مطیع ہو جائیں گے اور اسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کی تہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہوگی۔ یعنی رامائن کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہوگا۔ اشعار کی لے اور نغمہ سرائی کی تاثیر ہوگی۔ پہلی تصریح غالباً اس باب میں ہے جو "فی ذکر علوم لہم کاسرۃ الاجنحۃ علی افق الجہل" کے عنوان سے ہے۔ اور دوسری تصریح اس کے بعد کے باب میں ملے گی جو "فی تعارف شتی من بلادھم و انہارھم" کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زمانۂ حال کا علم الحیوان اس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا اور ان اثرات کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں سرے سے سماعت کا حاسہ ہی نہیں ہے۔

---

۱ مقتبس از غبار خاطر

Marfat.com

اصطلاحات

جن کے اردو یا انگریزی متبادل مولفؒ نے استعمال کیے

ALTITUDE	ارتفاع
ASTRONOMICAL	فلکی، ہیئت سے متعلق
ASTRONOMICAL OBSERVATION	رصدی تحقیقات، ارصاد فلکی
ASTRONOMY	علم الافلاک، فلکیات، علم ہیئت
ASTROLOGY	علم نجوم، جوتش
AXIS(OF EARTH) EARTH AXIS	محور (زمین کا)، محور ارضی
CARTOGRAFHY	علم رسم الارض، نقشہ نگاری
CLIMATE, COUNTRY	اقلیم
DECLINATION	میل
DEGREE	درجہ
DEGREE OF LATITU	درجہ عرض البلد
DEGREE OF LONGITUDE	درجہ طول البلد
EARTH AXIS	محور (زمین کا) محور ارضی
EQUATOR	خط استوا
GEOGRAPHY	جغرافیہ، فنِ جغرافیہ
GEOMETRY	علم ہندسہ
GLOBE SPHERE	کرہ ارضی

Marfat.com

GLOBULAR	کروی، کرے کی شکل کا
GRATICULE	تخطیط
HEMISPHERE	نصف کرہ
HEAVENLY BODIES	اجرامِ سماوی
LAND SERVEYING	مساحت
LATITUDE	عرض البلد
LINE OF A LATITUDE	خط عرض البلد
LONGITUDE	طول البلد
MAGNITUDE	صعود
MENSURATION	مساحت
MERIDIAN CERCLE	دائرہ نصف النہار
METAPHYSICS SCHOOL	مذہب مابعد الطبیعات، مابعد الطبیعاتی مکتبہ فکر
MINUTE	دقیقہ
OBSERVATORY	رصدگاہ
OBSERVATION	رصد، مشاہدہ
ORTHOGRAPHIC PROJECTION	تسطیح کرہ
PRACTICAL ASTRONOMY	(فن) صناعۃ الہیئۃ التجریبیہ
SCHOOL	مذہب
SECOND	ثانیہ
SEVEN CLIMATE, SEVEN REGION (Whole World)	اقالیم السبعہ، ہفت اقلیم، ہفت کشور
SEXTANT	الفخری
SOLAR ECLIPSE	سورج گرہن

Marfat.com

SPHERIC STRONOMY	رفن ، الہیئۃ الکروی
STADIA	قدیم یونانی اسٹاڈیا آج کل کے چھ سو فٹ نواخ کے برابر ہوتا ہے
STANDARD LINE	خط معیار
STEREOGRAPHY	سطح مستوی پر ٹھوس تصویر بنانے کا فن
TABLE	جدول، زیچ
TANGENTS	جیوب و امیال

البیرونی

اور جغرافیۂ عالم

مولانا ابوالکلام آزاد